NC

Cathy

A

۱۹۱۵۴۳۷

ح ۲۷۵ ح

Chutkian

Chutkiyan Aur Gud
Gudiya

یامعین　　　　هوالکل

مہذب ظرافت کی مشہور کتاب!

چٹکیاں

اور

گدگدیاں

از خواجہ حسن نظامی دہلوی

جون ۱۹۲۳ء میں چوتھی بار ابن عربی کارکن حلقہ مشائخ دہلی نے
چھپوا کر شائع کیں

چوتھی بار ۲۰۰۰ 　 مطبوعہ دلی پرنٹنگ ورکس دہلی باہتمام لالہ ٹھاکر داس اینڈ سنز 　 قیمت بارہ آنے

۷۸۶ یامعین

ہوالعلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

چٹکلیاں اور گدگدیاں نئی دل لگی

یہ کتاب جس کا نام چٹکلیاں اور گدگدیاں ہے نئی اُردو کے نئے لطیفوں کا مجموعہ ہے ظرافت ہر بڑی اور مشہور زبان کا لازمی اور ضروری حصہ ہے قوموں کی زندگی زبان سے ہوتی ہے اور زبان کی زندگی میں جہاں علوم وفنون کا بڑا حصہ مددگار ہوتا ہے وہاں بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی بھی اس کی جان سمجھی جاتی ہے۔ اسلام نے ایسی ظرافت کی اجازت دی ہے جسمیں جھوٹ اور فحش و بے شرمی کی باتیں نہ ہوں کسی خاص شخص کی دل آزاری نہ ہوتی ہو۔ رسول خدا صلعم کی مبارک زندگی میں اس قسم کی جائز ظرافت کی بہت سی مثالیں پائی جاتی ہیں۔

مشہور واقعہ ہے جس کو سب مسلمان جانتے ہیں کہ ایک دن پیغمبر خدا صلعم اپنے اصحاب کے ساتھ بیٹھے کھجوریں نوش فرما رہے تھے۔ دسترخوان پر حضرت علیؓ بھی تھے۔ پیغمبر خدا کھجوریں کھا کر گٹھلیاں حضرت علیؓ کے آگے رکھتے جاتے تھے جب کھانے سے فراغت ہوئی تو آنحضرت صلعم نے فرمایا۔ جس کے آگے گٹھلیاں زیادہ ہوں۔ اس نے کھجوریں

زیادہ کھائی ہونگی۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا۔ نہیں جس کے آگے گٹھلیاں نہوں اُس نے زیادہ کھائی ہوں گی۔ کیونکہ وہ گٹھلیاں سمیت کھجوریں کھا گیا۔

یہ معاشرت کی ظرافت تھی اور باوجود اس ادب و احترام کے جو رسول خداؐ کا حضرت علیؓ کرتے تھے۔ انھوں نے ہنسی کی گفتگو میں لطیف اعتراض کا لطیف و بے باکانہ جواب دیا۔

مذہبی معاملات میں بھی آنحضرتؐ کبھی کبھی ظرافت فرماتے تھے۔ مگر اس میں جھوٹ اور بیہودگی کا ذرا دخل نہ تھا۔ ایک دفعہ آنحضرتؐ نے فرمایا۔ کوئی بوڑھی عورت بہشت میں نجائیگی اسپر بڑھیا عورتوں کو بڑا فکر ہوا اور وہ آزردہ ہونے لگیں تو آنحضرتؐ نے سمجھایا کہ جنت میں سب لوگ خواہ عورت خواہ مرد جوان ہو کر داخل ہونگے چاہے وہ مرتے وقت بچے ہوں چاہے جوان ہوں چاہے بوڑھے ہوں بہشت میں داخلہ کے وقت خدا سب کو جوان بنا دے گا۔ آنحضرتؐ کا یہ فرمانا خوش طبعی سے تھا کہ بڑھیا عورتیں بہشت میں نہ جائیں گی۔

اسلامی خلفا اور بادشاہوں کے ہاں بھی مہذب مذاق و ظرافت کا عموماً چرچہ رہتا تھا عرب کے ظریف شاعروں کی بڑی قدر کیجاتی تھی۔ فارس کے خوش طبع لوگ بھی شاہی درباروں میں بہت عزت قدر سے رکھے جاتے تھے۔

آجکل یورپ کے مہذب ملکوں اور قوموں نے تو ظرافت کو بھی ایک فن بنا دیا ہے۔ چند سال ہوئے امریکہ کا مشہور مسخرا مارک ٹوئین لندن میں آیا تو سارے انگلستان نے اس کی آؤبھگت کی اور خود بادشاہ نے اسکو اپنے پاس بلایا۔ اور اسکی باتیں سنیں۔ مارک ٹوئین کے لطیفے اردو زبان میں بھی چھپتے تھے۔ مگر ہم اہل مشرق کی نظر میں اس امریکن ظریف کی باتوں میں کوئی خاص لطافت نہ تھی۔

ہندوستان میں مغل پٹھان بادشاہوں اور امیروں کے دربار ظریفوں سے بھرے رہتے تھے اور وہ تفریحی اوقات میں ان لوگوں سے بات چیت کر کے دلوں کو زندہ کیا کرتے تھے اُردو زبان کا رواج ہوا تو سب سے پہلے اسمیں ریختی کی نظمیں زیادہ کہی جاتی تھیں۔ بلکہ

اُردو کی غزل کو ہی اس زمانہ میں ریختی کہا جاتا تھا۔

یہ نظمیں عموماً عورتوں کی زبان میں اور مذاقیہ ہوتی تھیں۔ دو ایک شاعر مثلاً جان صاحب اور چرکین تو اس ریختی ظرافت میں شہرۂ آفاق ہو گئے تھے اور اسقدر حد سے بڑھے تھے کہ اب انکا کلام بسبب غلیظ و فحش ہونے کے شائع ہونا سرکار نے بند کر دیا ہے۔

اُردو کے دور اوّل میں نثر و نظم کی ظرافت بہت جلدی ہزل و بیہودگی میں گر پڑی تھی اسواسطے اسکو کچھ ترقی نہ ہوئی اور اعلیٰ طبقوں کی شرافت و سنجیدگی نے بازاریوں میں اسکو پھینک دیا۔ جب انگریزی حکومت جمگی اور یورپ کے نئے خیالات اُردو میں سمانے لگے تو ظریفانہ اخبار جاری ہوئے جن میں لکھنؤ کے اودھ پنچ نے خوب دھاک بٹھائی اور ملک کے بڑے بڑے نامور انشا پردازوں نے اپنی شوخ نویسی کے جواہر اسمیں دکھائے۔ یہ ظرافت مذہبی معاشرتی اور قوم و ملک کے سیاسی معاملات میں دکھائی جاتی تھی مگر اسکا لطف تعلیم یافتہ اور اونچے درجہ والے اخباربین لوگوں تک محدود تھا۔ عوام اور متوسط درجہ کے لوگ اکبر بیربر کے لطیفوں سے جی بہلایا کرتے تھے۔ یا جان و چرکین کی نظموں کے چرچوں میں رہتے تھے۔

جوں جوں تعلیم بڑھی اور اردو زبان میں شائستگی آئی۔ ظرافت کا رنگ بھی بدلنے لگا اور قدرت نے ایک عجیب شان کا زندہ دل شاعر اُردو میں پیدا کیا۔ یہ خان بہادر مولنا سید اکبر حسین صاحب الہ آبادی ہیں جنکو "لسان العصر" کے نام سے لوگ یاد کرتے ہیں۔

جناب اکبر اوّل اوّل اودھ پنچ کے لطائف نویسوں میں دھوم مچا چکے تھے اور بلند مجلسوں میں انکا غلغلہ پڑ چکا تھا۔ اخباروں اور رسالوں کی کثرت ہوئی تو عوام میں بھی انکے اشعار برسنے لگے۔

انصاف یہ ہے کہ ستھری سنجیدہ اور دل میں چٹکیاں لینے والی اور پھر ہر اعتبار سے کام کی ظرافت کی داغ بیل حضرت اکبر کے قلم نے اُردو ادب میں ڈالی ہے۔ ان کے بعد جو اس میدان میں آیا انہی کی پکی سڑک پہ دوڑا۔ اکبر کا کلام نہ کسی کو نصیب ہوا نہ میسر آنا ممکن ہے کیونکہ وہ غیب سے ایسی طاقت و قدرت لائے ہیں کہ جس کے دل میں چٹکی لیتی ہیں

وہ بجائے آہ کرنے کے واہ کرتا ہے۔

ان کی چھیڑ زیادہ تر نئے فیشن کے کردار گفتار، رفتار کے ساتھ ہوتی ہے اور وہ اس چھیڑ سے اپنے اصلی تمدن کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ جو باعتبار ایک مشرقی بزرگ ہونے کے ان کا فرض ہے کہ اپنی قدیمی سوسائٹی کی روایتوں کو سنبھالے رکھیں۔

انہوں نے خیالات مذہب اور اس کی بُری تبدیلیوں پر اس کثرت سے چٹکیاں لی ہیں کہ عقائد مذہب سے پھسلنے والوں کا دل ہی جانتا ہوگا۔

ایسا ہی معاشرت کی نیرنگیوں نے ہر چھوٹے بڑے رجحان کو چٹکی اور گدگدی سے خالی نہیں چھوڑا۔ اور وہ ان نوجوانوں یا اہل زمانہ کے بھی چٹکیاں لیتے ہیں اور ان عقائد و خیالات کے بھی گدگدیاں کرتے ہیں جو سیاست و پالیٹکس میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

میری طبیعت کی افتاد

شوخی وظرافت کے خلاف واقع ہوئی ہے۔ میں زیادہ تر غم و درد کے مضامین میں اپنے دل کو مائل پاتا ہوں۔ اور جن لوگوں کو میرے گذشتہ ایام کے مضامین یاد ہوں گے وہ گواہی دے سکتے ہیں کہ اُردو ادب میں میری شناسائی بیان درد تک محدود تھی اور اب بھی جسقدر رجی کا بہاؤ دُکھ کی جانب ہے سکھ کی جانب نہیں ہے۔

مگر جناب اکبر کی ہمنشینی اور کچھ اس احساس کے سبب کہ نثر اُردو میں مفید ظرافت کا رواج بڑھے مجھ کو بھی شوق ہوا کہ اُردو سے اس میدان میں طبع آزمائی کروں غم و سوز کی باتوں پر میں آمد سے لکھتا تھا ہنسی مذاق کے لئے اُردو کی ضرورت پڑی اور چند اخباروں میں اس پیرایہ پر آزمائشی قلم فرسائی کی۔

پہلے ظرافت کے لئے مختلف عنوان اخباروں میں ہوتے تھے، کوئی مذاق کے ماتحت لکھتا، کوئی لطائف وظرائف کی سرخی قائم کرتا، کوئی غپ شپ کوئی کچھ کوئی کچھ۔

میری عادت تقلید کی نہیں ہے اس واسطے میں نے اُردو ہی سے اس کا عنوان بنایا

تصنیف کیا اور اس کا نام چٹکیاں اور گدگدیاں رکھا۔

ابتک ان عنوانوں سے خلقت کی طبیعتیں مانوس نہیں ہوئی ہیں اور ان کے ذیل میں جو ظریفانہ مضامین لکھے جاتے ہیں ان کو سنجیدہ تصور کر لیا جاتا ہے، چنانچہ لکھنؤ کے اخبار ہمدم میں میں نے ایک ظریفانہ نوٹ "چراغ گل کردو" کے عنوان سے لکھا تھا اور اوپر گدگدیاں بھی لکھوا دیا تھا اسپر بھی غلط فہمی ہوئی۔ اور لوگوں نے اس کو سنجیدہ مضمون سمجھ لیا معمولی آدمیوں تک نہیں۔ بی اے پاس اخبار نویس نے اسپر نکتہ چینی کی اور میں نے عشق کا جو مذاقیہ علاج بتایا تھا اسپر اپنے روزانہ اخبار میں ایک لیڈر کے ماتحت جرح و قدح کی اور اس کے بعد اسی صوبہ کے متعدد اخبارات مجھ پر برس پڑے،

مجھے ان لوگوں کی غلط فہمی سے وہی لُطف آیا جو جنّت سے ممنوع بڑھیوں کے گھبرانے سے آنحضرت صلعم کے وقت میں مسلمانوں کو آیا ہو گا۔

یہ تو اخبارات کی غلط فہمی ہوئی حکام سلطنت کی خوش فہمی ملاحظہ فرمائیے۔

اخبار خطیب میں ایک ہنسی کا چٹکلہ بعنوان "پیاری ڈکار" لکھا تھا اور اسمیں آجکل کے شورش کن ترش نویس لوگوں کے لہجہ میں خود ان سخت زبانوں کا مضحکہ اڑایا تھا جو خواہ مخواہ حکومت کو اپنی زبان درازی سے دق کیا کرتے ہیں۔ ڈکار کی آزادی کا مطالبہ کیا تھا۔ آسانی سے سمجھ میں آسکتا تھا۔ کہ اس مضمون کا مقصد نئے فیشن کے اس خیال کی ہنسی اڑانا ہے کہ وہ ڈکار لینے کو برا سمجھتے ہیں، اور اس مضحکہ کو دانستہ انہی دشمنان ڈکار کے انداز گفتگو میں لکھا تھا۔ کہ اگر ڈکار کو آزادی نہ ملی تو میں باغیانہ تقریریں کرونگا، اور یہ ہو گا اور وہ ہو گا۔ اس مضمون کا سی آئی ڈی کے محکمہ نے ترجمہ کر کے گورنمنٹ میں پیش کیا، اس کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ شاید میرا ڈکار سے کچھ اور ناگفتنی مطلب ہے!

مگر غنیمت ہے کہ انگریز حکام کے کان مارک ٹوئین کے فلسفہ ظرافت سے آشنا تھے جو انہوں نے اس ترجمہ پر توجہ نہ کی۔

نثر کے ظریف

میں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں، کہ نظم کی شوخ اور مفید و علمی ظرافت کے بعد نثر میں سب سے بہتر ظرافت لکھنے والے مولوی محفوظ علی جنابی اے ساکن بدایوں ہیں، ان سے زیادہ نیچرل اور بیساختہ چلبلی اور راز سرتاپا مرصع ظرافت کوئی نہیں لکھتا، یا میرے علم میں نہیں اخبار ہمدرد میں تجاہل عامیانہ کے عنوان سے جو مضامین شایع ہوا کرتے تھے ان میں زیادہ وہ حصہ موصوف کا ہے (وہ اس فاش گوئی اور راز گفتن سے مرانہ مانیں) انکے بعد بھوق اور مسٹر شوکت علی کا نمبر ہے۔

مسٹر ظفر علی خاں زمیندار کو بھی مذاقیہ مضامین کا خاصہ ملکہ ہے مگر میں انکو ایک دوسرے فن کے اعتبار سے اوّل درجہ دونگا یعنی وہ کسی کی ہجو کرنے میں ایسا کمال رکھتے ہیں جس کی مثال اُردو نویسوں میں سوائے مرزا حیرت کے اور کہیں نہیں ہے،

اگرچہ میں مرزا حیرت کو فوقیت دیتا ہوں کیونکہ وہ آسان اور نہایت میٹھی زبان میں ہجو کرتے ہیں اور ظفر علی خاں ادق اور مشکل عبارت میں،

میری ظرافت

جس کا نمونہ اس کتاب میں ہے درحقیقت ظرافت نہیں ہے میں نے خود اقرار کیا ہے کہ یہ اُردو ہے اور لوگوں میں زندہ دلی اور لطیف نکتہ چینی کا شوق پیدا کرنے کو یہ طومار تیار کیا ہے۔

ناظرین کو یہ اندازہ ہو جائیگا کہ اکثر مضامین میں جناب اکبر کا پیرایہ میرے پیش نظر ہے۔ وہ نظم کے دو جملوں میں جو بات کہتے ہیں میں نے اس کو ایک بڑے مضمون نثر میں ادا کیا ہے،

بعض مضامین کی شوخی کھلی ہوئی ہے بعض کی عبارت اوپر کی سطح سے سنجیدہ معلوم ہوتی ہے مگر اثر دل پر ظرافت کا ہوتا ہے۔

دانستہ بھی ایسا کیا ہے کہ بعض شوخ مضامین گورکا کٹ میں گر جانے کے اندیشہ سے متانت کی چادر اُڑھا دی ہے،

لکھتے لکھتے اب مجھ کو اتنی مشق ہوگئی ہے کہ آورد کی غور کی ضرورت نہیں پڑتی اور میں بیتکان لکھتا چلا جاتا ہوں - اس سے نومشق جوانوں کو نتیجہ نکالنا چاہیئے، کہ مشق کرتے کرتے وہ بھی سب کچھ کر سکتے ہیں،

ہماری قوم میں آجکل (شاید) ایک بڑا نقص یہ ہے کہ خود کوئی بات ایجاد کرنے کا شوق نہیں رکھتے دوسروں کی تقلید وپیروی کرتے ہیں،

اب ہم لوگوں کے پاس زبان کے سوا کیا باقی رہا ہے مگر اس میں بھی ترقی نہیں کرتے اور چیزوں میں تو خیر دوسروں کی محتاجی اور مفلسی کا شکوہ ہے زبان میں کیا شے مانع ہے اگر ہر مضمون نگار اپنی تحریر میں کسی خاص جدّت کا خیال رکھا کرے تو خود اس کو بھی مزا آنے لگیگا ایک نئی راہ بھی نکل آئے گی اور اُردو چند روز میں کہیں پہنچ جائے گی؛

ہنسی مزاق میرا کام نہ تھا - مگر میں نے محض زبان اُردو کی خاطر اس میں دخل دیا - اور کچھ لکھا جو سامنے حاضر ہے، اگو میں مانتا ہوں کہ لطافت وظرافت جسکا نام ہے وہ ان مضامین میں نہیں ہے، تاہم بالکل نہونیکے مقابلہ میں کچھ ہونا بہتر تھا اس واسطے حمابو دنہ رہنے دیا،

میرے تازہ مجموعہ مضامین پر جو سیپارۂ دل کے نام سے گذشتہ مہینے شائع ہوا ہے، جناب مولوی عبدالحق صاحب بی - اے، سکریٹری انجمن ترقی اُردو نے دیباچہ لکھتے ہوئے ایک فقرہ یہ بھی لکھا تھا، کہ ان مضامین میں غالب کی طرح ظرافت کی چاشنی نہیں ہے لہذا آج میں مغلوب کی طرح ظرافت کی چاشنی چکھانے لایا ہوں؛

تقسیم ابواب

اس مختصر سے رسالہ میں بڑا دیباچہ چھوٹے قد پہ بڑا عمامہ معلوم ہوتا ہے جیسے ابکے اکتوبر سنہ ۱۶ء کی راجہ نواب کانفرنس میں پنجاب کے ایک راجہ صاحب پر ایک دلی والے نے پھبتی کہی تھی کہ "اتنی سی بٹیا سوا گز کی چٹیا"، کیونکہ انکا قد بہت چھوٹا اور عمامہ بہت بڑا تھا،

مگر میں در اصل اس رسالہ پر دیباچہ نہیں لکھتا، بلکہ اپنی قوم کو زبان کی طرف توجہ دلانے کو

یہ خامہ فرسائی اور طول کلامی کرتا ہوں۔ ابتدائی شوق کے مضمون نگاروں کو راستہ بتانا اور ان کی ہمت بڑھانا میرا مقصد ہے اور انہی کے لیئے ان مضامین کو جمع کر کے ایک جگہ شائع کیا جاتا ہے،

لکھتے وقت تو یہ بات مدِ نظر نہ تھی، مگر اب جمع کرتے وقت میں نے ان مضامین کو علیحدہ علیحدہ بابوں میں تقسیم کرنے کے قابل پایا، ایک باب مذہبی مقرر کیا اور اس کے نیچے وہ مضامین جمع کیئے جنکا تعلق کسی مذہبی مسئلہ۔ خیال یا عقیدہ سے تھا، دوسرا معاشرت کا رکھا جس میں تمدنی و زندگانی رہنے سہنے کی باتوں پر جو چھیڑ تھی وہ مضامین درج کیئے گئے۔ تیسرا باب خالص اور محض ادب انشا پردازی کا رکھا جس میں صرف الفاظ و عبارت کا لطف ہے اور کچھ نہیں،

مضمون لکھنے والوں کو مشورے

آخر میں ان کی خدمت میں چند مشورے پیش کرتا ہوں جن کو مضامین لکھنے کا ابتدائی شوق ہے کہ وہ اس سنجیدہ و مہذب ظرافت میں طبع آزمائی کر کے زبان کے اس حصہ کو اور کشادہ کریں۔ لطیف اور ذو معنی عبارت کا انسان کے دل پر بہت اثر ہوا کرتا ہے ملک و قوم کے معاملات پر اس انداز سے مباحثے کیئے جائیں گے تو بے حس لوگوں کو خواہ مخواہ ان سے لگاؤ پیدا ہو گا۔

یورپ والوں نے کارٹون یعنی مضحکہ انگریز تصویروں کے ذریعہ بڑے بڑے کار ملک و قوم کے انجام دیئے ہیں۔ تمہارے یہاں تصویر نا جائز ہے تم نے جس طرح فن مصوری کے مقابلہ میں فن خوشنویسی ایجاد کیا تھا اسی طرح کارٹون کی بجائے تم نثر و نظم میں نہایت خوبی و اختصار کے ساتھ ظریفانہ چٹکلے لکھا کرو جو انسانی دل پر اور دماغ پر تصویر کا کام دیں۔

ایک بات اور ہے جس کا خیال بہت کم کیا جاتا ہے کہ لکھنے والے آسان اور

عام فہم زبان نہیں لکھتے۔ عربی۔ فارسی کے موٹے موٹے الفاظ عبارت میں ٹھونس دیتے ہیں مگر وہ کیا کریں مجبور ہیں ان کو عادت ہی ایسے مشکل مضامین لکھنے کی پڑ گئی ہے لہذا میں ابتدائی مشق کرنے والوں کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ وہ شروع ہی سے اس کا خیال رکھیں کہ حتی المقدور مشکل الفاظ عبارت میں نہ آئیں اور فقرے چھوٹے چھوٹے ہوں۔

ظرافت کے مضامین میں تو صاف الفاظ اور چھوٹے چھوٹے فقروں کی ازحد ضرورت ہے۔ کیونکہ بغیر اس کے عوام اس سے متاثر نہیں ہو سکتے اور انہی کے متاثر کرنے اور سیدھے راستہ پر لانے کی ضرورت ہے۔

حسن نظامی

باب اوّل

امور مذہبی

جہادی شہید کا کفن

نکالا شیخ کو مجلس سے اُس نے یہ کہہ کر — یہ بیوقوف ہے مرنیکا ذکر کرتا ہے

میں چودھویں صدی کا مسافر گھر سے چلتا ہوں۔ تو ٹفن باسکٹ اور اخبار کا پرچہ سردی ہو تو ایک فیشن ایبل کمبل ضرور ساتھ رکھتا ہوں گذشتہ صدیوں کے مسلمان سفر کو جاتے تھے تو جانماز۔ قرآن شریف۔ لوٹا۔ مسواک۔ اور کفن بھی ساتھ لے لیتے تھے۔ کیونکہ ان کو عبادت اور موت کا گھر سے نکل کر بھی خیال رہتا تھا۔

یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ سامان سفر میرا اچھا ہوتا ہے یا انکا اچھا ہوتا تھا۔ اس کا فیصلہ ہر شخص اپنے اپنے مذاق کے موافق کر سکتا ہے۔

البتہ کفن کی نسبت اتنا کہہ سکتا ہوں کہ یہ بہت ہی ڈراؤنی چیز ہے۔ اسکو میں اپنے ڈریس روم میں بصورت فوٹو بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔ عجب بیہنگم لباس ہے اور لباس بھی اُسوقت کا جسکا خیال کرنے سے قوت عقل کو صدمہ ہوتا ہے اور خواہ مخواہ عیش و راحت میں کرکراہٹ ہونے لگتی ہے۔ سنتا ہوں مسلمانوں کے ہاں ایک حدیث آئی ہے کہ جو شخص ایک دن میں چالیس بار روزانہ موت کو یاد کر لیا کرے تو اس کو شہید کا درجہ ملتا ہے۔ میرے فیملی ڈاکٹر کو اسکی خبر ہو جائے کہ اس نے ایسی بات سُننے کا ارادہ کیا ہے تو وہ ضرور کلوروفارم لیکر دوڑ آئے یا افیون کا ست پلائے یا برانڈی کے چند قطرے حلق میں ٹپکائے۔ کیونکہ اُسکو میری صحت کا بڑا خیال رہتا ہے۔

اور وہ نہیں چاہتا کہ ایسی وہمی چیزوں سے میرا دماغ پریشان ہو۔

میں ان دنوں وسکی کا ایک گلاس زیادہ پینے لگا ہوں کیونکہ کمبخت واہمہ لڑائی کی ڈراؤنی شکلیں سامنے لے آتا ہے اور دل سے کہتا ہے کہ سب آدمی مر جایا کرتے ہیں میرا دل ایسا واقع ہوا ہے کہ وہ مرنیکے خیال میں فوراً جی لگا لیتا ہے۔ ہر چند اس کو ادھر سے ہٹاتا ہوں۔ مگر وہ میدان جنگ کے بے گور وکفن مُردوں کے دیکھنے سے باز نہیں آتا اور ٹھنڈے سانس بھر کے کہتا ہے ایکدن سب کو اسی طرح مرنا ہوگا۔ میں نے بارہا اس سے پوچھا کہ مجھ کو بھی؟ تو اس نے ذرا رعایت نہ کی اور یہی کہا ہاں تجھ کو بھی۔ اس لئے میں نے مجبوراً جام شراب سے اس کا مُنہ بند کیا اور تھوڑی دیر کے لئے اس سے نجات حاصل کی۔

کل کی سنو! ایک مُسلمان شہیدوں کے کفن کی نسبت بحث کر رہا تھا۔ میں نے چاہا۔ کہ سُنی ان سُنی کردوں۔ مگر اس نے کہا کہ آپ بھی تو مسلمان ہیں۔ مجھے کچھ شرم سی آئی۔ اور اور میں نے سائل کی رعایت سے الحمد للہ کہدیا۔

یہ لوگ بڑے بے تہذیب ہوتے ہیں اتنا خیال نہ کیا کہ میں نے کتنی بڑی جرأت کر کے اس کا دل ٹھنڈا کیا تھا۔ چاہیئے تھا کہ خاموش ہو جاتا مگر وہ تو گلے کا ہار ہو گیا۔ بولا شہید کو کفن نہیں دیا جاتا۔ وہ اپنے ملبوس خون آلودہ ہی میں بغیر غسل کے دفن ہوتے ہیں۔ خون انکا غسل ہے اور خون بھری پوشاک ان کا کفن وفن۔ کفن کا ہم وزن لفظ سنکر مجھے ایک پھریری سی آئی۔ اور دل کے اندر سینہ کے پیچھے میں درد کی سی کسک معلوم ہوئی۔ میں ڈرا۔ کہ کہیں ہارٹ فیل (دل کی حرکت) بند نہ ہو جائے۔ میں نے اپنا سگار جلایا اور اس سے بولا کیوں صاحب کل کرکٹ کا میچ کیسا رہا۔ اس وحشی نے جواب دیا آپ گیند بلے کو پوچھتے ہیں مجھے اس کی بابت کچھ معلوم نہیں۔ اتنا کہہ کر پھر شہید کے کفن کو لے بیٹھا کہ وہ کیسی اچھی موت ہے۔ مسلمان دولہا بن کر خدا کے سامنے جاتا ہے۔ سر کٹا ہوا۔ سینہ چھدا ہوا مگر آنکھیں اپنے معبود کے آگے جھکی ہوئیں۔

اب تو میرا دل لرزنے لگا۔ مجھ کو ایک جماہی آئی اور بائیں حصّہ جسم میں عشہ کا سا اثر محسوس ہوا۔ میں نے اس سے کہا کیا تم نے دیکھا میرا بایاں ہاتھ اور پاؤں کچھ کانپتا ہے۔ فالج تو نہیں ہے۔ اس نے ہنسکر جواب دیا۔ جی نہیں وہم ہے! اور بالفرض فالج ہو بھی تو کیا ڈر ہے۔ ہم تو خدا رسولؐ کی باتیں کر رہے ہیں۔ ہمیں جو تکلیف ہو ثواب میں لکھی جاتی ہے۔

یہ سُنکر مجھ کو تاب نہ رہی۔ اس کی دیدہ دلیری اور بے ہر اسی پر غصّہ بھی آیا اور ترس بھی کہ یہ لوگ کسقدر کمزور عقیدہ رکھتے ہیں۔ اور زندگی جیسی پیاری چیز کی خاک قدر نہیں جانتے اور میں نے اس کو ترشی سے یہ گفتگو بند کرنے کا حکم دیا۔

خیر ہو گئی۔ کہ ڈیر فادر ہمٹ ادہر آ نکلے۔ اور میں ان کے ہمراہ اُٹھکر چلا آیا۔ تاہم جہادی شہید کا کفن رات بھر سر پر سوار رہا۔ اسی واسطے آج آٹھ بجے کے بدلے دس بجے بیدار ہوا ہوں۔

لبِ بام ٹکٹکی

ایک بزرگ نے حضرت معروف کرخی کو خواب میں دیکھا۔ کہ عرش اعظم پر ٹکٹکی جمائے کھڑے ہیں۔ اور دیدِ دیدار میں مصروف ہیں۔

پوچھا یہ مرتبہ کیونکر ملا۔ کسی نے کہا کہ انہوں نے عبادت بہشت کے لالچ اور دوزخ کے ڈر سے نہیں کی تھی۔ بلکہ حب الٰہی انکا مقصود تھا۔ اسواسطے خدا تعالیٰ نے یہ مقام دیدا رِ ازلی عطا فرمایا۔ میں اگر شاہدان بازاری کے کوٹھوں پر ٹکٹکی لگانے سے فرصت پاؤں تو عجب نہیں ہے کبھی اس شاہد حقیقی کے بام تک پہنچ جاؤں مگر ابھی تو مجھ کو اپنے تعمیر مکان کی تیسری منزل کا خیال زیادہ رہتا ہے۔ زندگی میں اس کو بنا ہوا دیکھ لوں۔ آخرت کی خبر خدا جانے۔ کیا کروں دل تو کہتا ہے کہ زہد و عبادت میں بڑا ثواب ہے۔ مگر طبیعت ان باتوں میں نہیں لگتی۔ اور میرا جی ان باتوں میں کیونکر لگے۔ جب پیر جی صاحب ہی کا ناٹک سے دل بہلتا ہے۔

بنگلۂ خدا

پہلے ہم ایشیائی تھے۔ دیسی کہلاتے تھے، ہر چیز مشرقی اور دیسی وضع کی بناتے تھے۔ مگر اب فضلِ نیچر سے رتبۂ مغربیت حاصل ہوا ہے۔ کالے ہیں مگر چال ڈھال گوروں کی رکھتے ہیں۔ پہلے بوریہ پر یا مال پر یا بان کی چارپائی پر سوتے تھے۔ اب اسپرنگ کے لچکدار پلنگ پر آرام کرتے ہیں۔ پہلے گھروں میں قالین تھے۔ چاندنیاں تھیں گاؤ تکئے تھے، اب میزیں ہیں۔ کرسیاں ہیں۔ کوچیں اور بنچیں ہیں۔ پہلے جوتیاں فرش کے باہر اُتارتے تھے۔ اب جوتیوں سمیت فرش پر پھرتے ہیں پہلے مُنہ دھو کر کرتے کے دامن سے مُنہ پوچھتے تھے اب بازار سے اُجلے اُجلے تولئے لاتے ہیں پہلے بیسن اور کھلی سے ہاتھ دھوتے تھے۔ اب پیر کا صابن ہاتھ صاف کرتا ہے۔ پہلے غسل کے وقت پانی ہمارے اوپر آتا تھا اب ہم پانی کے اوپر سوار ہوتے ہیں اور ٹب میں بیٹھکر نہاتے ہیں۔

وہ وقت ہمکو یاد ہے کہ ہمارے چہروں پر لمبی لمبی گھانس خدا کا نور سمجھی جاتی تھی اب باغوں کی گھانس کترتے کترتے ہمنے اپنے چہروں کی گھانس کو بھی کترنا شروع کر دیا ہے اور ڈاڑھی مونچھ کو صاف کر کے ہمارے چہرے اصلی نورانی بن گئے ہیں۔

اس زمانہ میں سینہ کا چھوٹا سا دل خدا کا گھر سمجھا جاتا تھا اور ان دیکھا عرش اور اَن دیکھی کرسی ہمکو خوش کرتی تھی۔ اب بنگلوں کو خانۂ خدا بنایا ہے اور کرسی پر بیٹھکر عرش و کرسی کے فرضی افسانہ کو جی سے ہٹایا ہے مگر دیکھو پرانے زمانے والے اکبر الہ آبادی ابتک پُرانہ طعنہ دیئے جاتے ہیں اور کہتے ہیں ؎

خدا کا گھر نہ رکھا دل کو بنگلو میں مکیں ہو کر۔

بھلایا عرش کو اس قوم نے کرسی نشیں ہو کر۔

وہ تو وہ احمد آباد کے عبدالغفار صاحب لنگری شاہ بھی بولے، اور راندیر سورت کی فیشن ایبل مسجدوں کو دیکھ کر کہا کہ یہ مسجدیں خانۂ خدا نہیں بنگلۂ خدا ہیں۔

کیا غضب ہے یہ اگلے زمانہ والے ابتک بجے جاتے ہیں۔ کل کوٹھی میں آذان کی آواز سُنی گئی

تھی۔ آج ان کی زبانی بنگلہ خدا کا لفظ سُنا۔

جب مسجدیں ایشیائی طریق پر بنتی تھیں تو ان کو خانہ خدا کہتے تھے۔ اب ہمارے گھر خانہ نہیں رہے فارسی کا لفظ ان سے اُٹھ گیا تو مسجدیں بھی بنگلہ خدا مشہور ہونی چاہئیں۔ ہم اس طعن سے چڑتے نہیں ہیں۔ دیکھو راندیر کی مسجدوں میں کیسا جی لگتا ہے۔ سب ٹھاٹ ولایتی ہے۔ پُرانے زمانہ کی بھدی میلی کچیلی مسجدوں میں جاتے تھے، تو حضور قلب نہ ہوتا تھا اب ان مساجد کی چمک دمک اور مغربی اداؤں کی برکت سے دل اسی طرح جلدی خدا کے سامنے پہنچ جاتا ہے جسطرح مغربی ریل ہمکو گھنٹوں میں سینکڑوں میل پہنچا دیتی ہے۔ اور تار برقی منٹوں میں ہزاروں کوس ہماری خبریں لیجاتی ہے۔ تو کیا ہرج ہے۔ اگر ان مسجدوں پر بنگلہ خدا کی پھبتی کہی گئی۔

میں خاک پر وہ ہوا پر

کل میں خدائے پاک کے آگے خاک پر سجدہ کر رہا تھا۔ اوپر سے ایک ہوائی جہاز گزرا دل نے کہا خدا کو مٹی میں نہ دیکھ۔ ہوائی جہاز میں بیٹھکر آسمان پر چل اور عرش کو جھانک۔ اسپر ہوائی جہاز نے پکارا۔ دیوانے فرعون نے بھی سوچا تھا مگر آسمان تک نہ پہنچ سکا۔ تو خاکی ہے۔ خاک ہی کے اندر خدا کا جلوہ نظر آئیگا۔ یہ فرعونیاں انہی لوگوں کے واسطے چھوڑدے

خدا کی خاطر

ہم لوگوں نے ہزار سر مارا کہ اس ان دیکھے خدا کی اسیری سے رہائی ہو۔ مگر خبر نہیں اسکو کیا جادو آتا ہے اور اس نے انسانوں پر کیا پڑھ کر پھونک دیا ہے کہ ہر آدمی اسکا دم بھرتا ہے اور اس کی خوشی کی خاطر بڑی بڑی بلاؤں کو سر پر لیتا ہے۔

آجکل ہردوار میں کمبھ کا میلا ہے۔ سولہ سترہ لاکھ انسانوں کا جماؤ ہے۔ ریلوں میں انسان

حیوانوں کی طرح بھرے جاتے ہیں جسم و روح کو تحلیل کرنیوالی تکلیفیں اُٹھاتے ہیں مگر خدا کے نام پر دریا میں ایک غوطہ مارنیکی خاطر گھر بار چھوڑ کر چاروں طرف سے اُمڈے چلے آتے ہیں۔ مناسب ہے کہ ایک بین الاقوام مشترکہ کانفرنس قائم کیجائے جسمیں غور ہو کہ خدا کا اثر کم کرنے میں ہم انسان کیا طرز عمل اختیار کریں۔ تاکہ ہمارے ہمجنس اس اٹون کی کشمکش سے نجات پائیں۔ گنگا اور زمزم کے پانی میں آخر کیا بات ہے۔ جو خلقت اسپر پلی پڑتی ہے۔ سوائے اس کے کچھ نہیں۔ کہ خدا نے ان پر کچھ سحر کر دیا ہے۔ اگرچہ جادو ٹونہ بھی خلاف عقل چیزیں ہیں لیکن بطور سُراغ رسانی و تفتیش تھوڑی دیر کے لئے ہم انکو تسلیم کئے لیتے ہیں، اسکے بعد تمام ملحدان یورپ کے منتخب آدمیوں کے ذریعہ کوئی نہ کوئی بات خدا کو زک دینے کی نکل ہی آئے گی۔ مگر ڈر یہ ہے کہ کہیں وہ جس کو خدا کہتے ہیں ہمارے ہی ہم قوم لوگوں کو ولی پیغمبر۔ رشی اوتار کے خطابات دیکر ہمارا مخالف نہ بنا دے۔ کیونکہ خطاب پا کر آدمی برادری کے حقوق سے کچھ بے تعلق ہو جاتا ہے

میاں طاہر کی صراحی

مشہور گروں والی مورت آئی جی کو بھائی۔ واہ کیسی اچھّی میاں طاہر کی صراحی دلّی و میرٹھ کی صراحی بہت نامور ہے۔ مگر اس بھادل پُری صراحی کی شکل نے سب کو مات کیا دیکھنا گردن ایسی ہوتی ہے۔ نہ دلّی کی صراحی کی سی بھدّی بدشکل۔ کہنے کو مٹی کی تصویر ہے مگر پیکر آدم کے عرفان کے لئے منزل حق کی لکیر ہے۔

وہ خود صراحی بنکر دُنیا میں آیا۔ آپ معرفت اپنے اندر لایا۔ جام گردش میں آئے۔ پینے والے جھوم جھوم کر متوالے کہلائے۔ مگر اب تو دور ہی اور ہے۔ صراحی ٹوٹ گئی۔ پانی بکھر گیا۔ جام خالی رہ گئے۔ پیالے آبخوروں کی جگہ آب بدن میں آ گئے۔ اب میں اس صراحی کو لیکر کیا کروں۔ میاں طاہر آب طہور لائے۔ شراب طہور ان کو نہ ملی تھی۔ بہشت کے

رضوان نے روکا تھا۔ تو سوڈا واٹر کی دوکان تو موجود تھی۔ میں تو نئی روشنی کا صوفی ہوں جنت کی شراب کے بدلے سوڈا واٹر۔ جنجر واٹر اور لیمونیڈ پیتا ہوں۔

اس صراحی کے نقش و نگار بھی خوب ہیں اور بناوٹ سجاوٹ بھی مرغوب ہے۔ لیکن جب اس کے بنانے والوں کا خیال کرتا ہوں۔ جو بھاولپور کے احمد پور میں رہتے ہیں و ننگے کھڑے ہوتے ہیں۔ کیسے بھدے ہاتھوں نے کیسی پیاری چیز بنائی ہے۔

اسی لئے تو کسی نے کہا ہے کہ نقاش کی صورت پر نہ جانا چاہیئے۔ اور حضرت مولیٰ علیؑ نے فرمایا کہ یہ دیکھ کہ کیا کہا۔ یہ مت دیکھ کہ کس نے کہا۔

میں اگر یہ دیکھتا۔ کہ صراحی کن ہاتھوں سے بنی تو بھاولپوری پنجابیوں کے خیال سے جی بیزار ہو جاتا۔ مگر میں نے اپنے آقا حضرت علیؑ کے مقولہ پر عمل کیا۔ قول کو دیکھا۔ قائل پر نظر نہ ڈالی تو پھر میاں طاہر کا قصیدۂ مدحیہ کیوں نہ پڑھوں کہ دنیا میں اظہار شکر و احسان لازمی ہے اور میرا شکرانہ سارے جہان سے بیگانہ ہوا کرتا ہے۔

وہ نینی تال بلاتے ہیں

میں نے نینی تال کا نام سنا تو آنکھوں میں آنسو بھر لایا۔ کیسا کھاری تالاب تھا۔ اشجار پلک اسی تالاب سے سرسبز ہیں۔ جب میں وہاں کیا آؤں اشک بھرے دو نین نینی تال سے بڑھ کر ہیں۔ ان ہی میں ٹھنڈک ہے۔ ان ہی میں گرمی ہے۔

زمانہ کے سرد و گرم سے کیا سروکار جب خود اپنے کوہ رخسار پر گنگا بہتی ہے اور آہ شرربار دل کے بنگلہ میں جاں گزیں ہے۔

آپ کو وہ ٹھنڈی ہوا مبارک سنگین نشیب و فراز مبارک۔ پانی کے شور مبارک عیش و راحت کے روز مبارک میں غریب نہ مرغی کا سوداگر ہوں نہ انڈے کا بیپاری۔ نہ میرے یہاں ڈبل روٹی بکتی ہے۔ نہ مکھن تیار ہوتا ہے۔ پھر میں پہاڑ پر کس کے کام آ سکتا ہوں۔ ہاں رونا دھونا منظور

ہو تو دو چار آہیں اس خط میں لپیٹ کر بھیجدوں۔ ان کو سینہ پر لٹکا لینا۔ خوب ہائے ہائے کرنے لگو گے میاں نینی تال میں رہتے ہو۔ یہ بھی خیال رکھنا۔ کہ ایک اور اپنے پہاڑ پر بھی جانا ہوگا جہاں اعمال کی بہار ہوگی۔ یہ اچھے نہ ہوئے تو سارے پہاڑی فرے کرکرے ہو جائیں گے۔

من کہ ایک دھوبی

کاغذی گھاٹ پر

جاری جار میں روٹی نہیں کھاتا۔ چاولوں کی پیچ ادہر کنارے پر رکھدے اور ایک چلم بھر کر لا۔ چھوا چھو، چھوا چھو، چھوا چھو، چھوا چھو۔

کیوں ری ننوا کی ماں۔ دریا کا پانی گدلا۔ صابن کم۔ میں کیونکر ان میلے کپڑوں کو صاف کروں۔ چھوا چھو، چھوا چھو، چھوا چھو، چھوا چھو۔

دیکھ درخت کا پتا سوکھ کر گرا۔ ہوا اُڑا لے چلی اب خبر نہیں یہ بچھڑا ہوا کب ملیگا۔ چھوا چھو، چھوا چھو، چھوا چھو، چھوا چھو۔

میرا بیل ہاتھیوں سے بڑا۔ گھوڑوں سے تیز۔ ریل سے زیادہ تابعدار۔ پھر تو کہتی ہے کہ امیر بڑے ہوتے ہیں۔ ان میں بڑائی میرے دم سے ہے۔ میں اُجلے کپڑے نہ پہناؤں تو ان کی دو کوڑی کی عزت ہو جائے۔

چھوا چھو، چھوا چھو، چھوا چھو، چھوا چھو۔

بھر لے حقہ مار لوں گھونٹ
بیتا جھائی چاروں کھونٹ

سُنتی ہے اس کاغذی گھاٹ پر آئی ہے۔ چُنری چولا دُھلوانے لائی ہے۔ تو میری بات مان یہ چولا من کے صابن سے دُھلے گا۔ جس کو پریم کی بھٹی میں چڑھاؤں گا۔ نیچے آگ

جلاؤں گا۔ اور پھر یہ گاتا جاؤنگا۔

اُو ـــــــــــ ہُو ـــــــــــ اُو

کیوں رے چولے کاٹوں تیرا میل پانی اُبلا جوش میں آیا۔ تو گھبرایا میل کٹا پاک ہوا صاف ہوا۔ اب کیسی سی۔سی۔آہ۔

اُو ـــــــــــ ہُو ـــــــــــ اُو

چھُوا چھُو چھُوا چھُو، چھُوا چھُو۔

یہ تن وہ من، تو دہوبن میں دہوبی سب ہیں ساجن۔ تو دہوبن میں دہوبی چھُوا چھُو چھُوا چھُو، چھُوا چھُو۔

کہنے دے ہم کمین ہیں۔ ہم موٹے وہ مہین ہیں۔ دیکہتی نہیں سارے باریک میرے ہاتھ میں ہیں۔ ان کو پتھر پر پچھاڑ رہا ہوں۔

چھُوا چھُو، چھُوا چھُو، چھُوا چھُو۔

یثرب نگر کے چودہری نے کہا۔ جو سارے سنسار کے میلے تنوں کو دہونے آیا تہا اسلام غریبوں سے شروع ہوا۔ اور پھر غریبوں میں آجائیگا، تو بس ہم تم دونوں اپنے چودہری کے بیان پر مگن ہیں، اسلام ہم ہیں ہم اسلام ہیں۔ اور سب امیر پیسہ والے من و تو کے کلام میں چھُوا چھُو، چھُوا چھُو، چھُوا چھُو۔

چھیو رام۔ چھیو۔ چھیو۔

پکا پکو کر وہیں دہر یا۔ بچاری وہیں دہر یا۔ تجھ سے اتنا کہا میں روٹی نہیں کھاتا۔ اَن اور جل دو بہن بھائی ہیں۔ اَن نے باوا آدم کو جنت سے نکالا۔ جل نے پاؤں میں بیڑی ڈالی۔ آدھی رات سے دریا میں کھڑا ہوں اور پانی کا قیدی ہوں جب جل نے جلایا تو اس کی بہن اَن سے کیا محبت ہو۔

چھیو رام، چھیو چھیو، چھُوا چھُو چھیو۔

ندی کنارے میں کھڑی اور پانی جھل جھل ہوئے میں میلی پیا اُجلے میر اکس بدھ ملنا ہوئے

چھیو رام چھیو اچھیا چھیا۔

کپڑے دھوتے ساری عمر دریا کے کنارے گذر گئی۔ مگر اپنا آپا میلا کا میلا رہا۔ صاف سُتھرے اور اُجلے پیا کی نظروں میں میری کیا قدر ہوگی اور اس تک کیونکر پہنچنا نصیب ہوگا۔

چھیو رام چھیو رام۔ چھوُ اچھوُ!

اچھی ری ذرا ایک بات اور سُنتی جا۔ دیکھیو خدا آسمان کی کھڑکی میں سے جھانک کر مجھ سے کچھ کہتا ہے۔ پورا تو سمجھ میں نہیں آیا۔ سوائے اس کے کہ اس نے کہا ہے

رام جھرو کے بیٹھ کے سب کو مجرا لیے

جیسی جا کی چاکری ویسا والو دیے

تو جب اس کی دین چاکری پر ہے تو لا میں کبھی اس دریا میں جہاز چلاؤں دھوبی کیوں کہلاؤں امیر البحر کیوں نہ بنوں اس سنسار میں۔

کرن کی بھسرن

ہے جو کرتا ہے۔ پاتا ہے۔ میں نے ساری عمر کپڑے دھوتے پیسہ ٹکے پر نیت رکھی۔ اتنا ہی ملا۔ خیال آگے بڑھاتا۔ رام زیادہ بھجواتا۔

چھیو رام چھیا رام ہوا و چھیو۔

اری ننوا کی ماں تو تو خفا ہوگئی۔ کہاں چلی لا میں روٹی کھالوں۔ تو جا مت۔ تیرا یہ خیال ہوگا میں تیرے خفا ہونے کی پرواہ نہیں کرونگا۔ اری مجھ کو تو اس کا بڑا دکھ ہوتا ہے اور دل میں بڑی جلن ہوتی ہے

سایئں تیں مت جایئو تو ہی چھوڑت موہی چین

گیلے بن کی لاکڑی سلگت ہوں دن رین

چھی ہو چھی ہو چھیا را ما چھیا۔ چھیو رام۔

اری کل رات کا خواب سُن۔ میں نے دیکھا ایک سُندر عورت اپنے بالم کو مایوس پنے سے دیکھ رہی ہے مگر منھ سے کچھ کہہ نہیں سکتی اتنے میں اسکا پتیم پیارا کہیں چلا گیا اور وہ ہاتھ ملنے لگی کہ ہائے میں تو دو باتیں بھی نہ کرنے پائی تھی کہ پیا بچھڑ گئے۔

میں نے کہا تو کون ہے اور یہ مرد کون تھا عورت بولی میں روح یعنی آتما ہوں اور یہ مرد پریم شکتی (مظہر عشق) ہے خواب دنیا ہے۔ اور عالم اسباب ہے اس عورت کی بات تو میری سمجھ میں آئی نہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ اس نے جو دوہا پڑھا تھا وہ یاد ہو گیا ؎

سپنے میں مورے پی ملے کر نہ سکی کچھ بات

سوتی تھی روتی اٹھی۔ ملت رہی دو ہاتھ

چھپو اچھو اچھو۔ چھپو۔۔

ہاں! ننوا کے باپو یہ تو بتا۔ تو میرا پیا۔ میں تیری پیاری۔ تو میرا دھوبی۔ میں تیری دھوبن پھر یہ پپیہا پی کہاں پی کہاں کیوں پکارتا ہے اس کو پی پی کہنے کا کیا حق ہے۔ تو کپڑے دھو چکے تو کچہری جائیو۔ اور پیا پیارے کے نام کو انگریز بہادر سے لکھوا لائیو۔ اس کے بعد پپیہا پی کو پکارے گا تو میں نالش کروں گی۔

نہیں ننوا کی ماں یہ تیری غلطی ہے۔ پی کا پکارنا پیا کا پیارا بننا آسان نہیں ہے۔ دیکھ بھونرا کیسا کالا ہوتا ہے مگر پی کی محبت میں اس کے مُنھ کی رنگت زرد ہوتی ہے۔ اری اس پریم کی بڑی کٹھن بپتا ہے پپیہا بھی جھوٹ موٹ پی کو پکارتا ہے اور تو بھی خواہ مخواہ اسمیں جھگڑا کرتی ہے۔ جن کے من میں پی بستا ہے انکے مُنہ زرد پڑ جاتے ہیں۔

جا من میں پیا بسے مکھ پیرا ہوئے

جا لیجاری وہیں دھریا پکا پکو کر وہیں دھریا۔

ننوا کے باپو یہ رات کو چکوا چکوی آپس میں کیا باتیں کرتے تھے میں نے تو اتنا سُنا کہ چکوا جمنا کے اس پار اپنی چکوی کو پکارتا تھا اور چکوی اس پار اپنے چکوے کو آواز دیتی تھی جب

انکے پر تھے تو اُڑ کر پاس کیوں نہیں جاتے تھے۔

دیوانی اس پریم کی ہزاروں ریتیں ہیں۔کہیں پروانہ چراغ پر آکر جل جاتا ہے کہیں بُلبل پھول کو گلے سے لگاتا ہے۔لوہے کو مقناطیس کی محبت دی گئی ہے۔کہ دیکھتا ہے تو بے اختیار اس کی طرف دوڑتا ہے۔تنکہ کہربا پر فریفتہ ہے۔دیدار پاتا ہے تو لپک کر سینہ سے چمٹ جاتا ہے مگر چکوے چکوی کی محبت یہی ہے کہ وہ جُدائی کی بہار دیکھیں۔وہ آپس میں مل نہیں سکتے ساری عمر ترستے رہتے ہیں۔اسی واسطے تو کہا ہے کہ چکوا چکوی کو نہ ستاؤ کہ وہ تو خود محبت کے ستائے ہوئے جُدائی کے صدمے اُٹھائے ہوئے ہیں۔

چھوڑ رام چھیو چھیو،

ننوا کے باپو تو نے کل کہا تھا۔یثرب نگر میں ہمارے چودہری سارے سنسار کے لتّوں کو دہونے آئے تھے۔اسکا بھید مجھ کو بتا کہ یہ کیا بات تھی۔

اوہو تو تو بڑی مورکھ ہے۔چل تجھے قوالی میں لے چلوں۔وہاں یہ بھید سمجھ میں آجائیگا۔ قوّال گا رہے تھے۔

میری میلی گدڑیا دہو دے !!

دھوبی نے کہا یہ میلی گدڑیا ساری دُنیا ہے۔خود ہمارے وجود ہیں اور ان کو گناہوں اور شک وشبہہ کے دھبوں سے صاف کرنے کے لئے خدا نے یثرب نگر میں جو عرب میں ہے اور جس کو مدینہ بھی کہتے ہیں۔ایک بڑے چودہری کو پیدا کیا جس نے سارے جہان کے دھبے دور کر دیئے اور یہ سب میلی گدڑیاں دہو کر رکھدیں یہی تو وجہ ہے کہ میں بیچارہ غریب دہوبی کاغذی گھاٹ پر کپڑے دہونے آیا ہوں۔

جادم کی درخواست

دلّی میں مینہ نہیں برستا۔ابر بھی نہیں آتا۔لڑائی نے ملکوں کا جغرافیہ بدلدیا ہے تو کیا

بادلوں کا جغرافیہ بھی کچھ تبدیل ہوگیا۔ وہ دلی میں کیوں نہیں آتے،
سنتے ہیں بارش سمندری بخارات سے ہوتی ہے۔ تو کیا سمندر سے دلی کے
حصے کا بخار اُتر گیا۔ اس کو کس ڈاکٹر نے کونین کی گولی دی۔
خدا سمندر کے دل میں ہجر کی آگ بھڑکائے تاکہ اس کی آہوں کے بخارات آنسو بنکر
ہم تک آئیں۔ اگر یہ غلط ہے اور سمندر کا اسمیں کچھ دخل نہیں، تو ہم اہل سائنس سے درخواست
کرتے ہیں کہ وہ اہل دہلی کے واسطے بارش بذریعہ وی پی پارسل بھیجدیں ہم سب لوگ چندہ کر کے وصول کر لینگے
اگر اہل سائنس کا اس میں کچھ اختیار نہو تو ہمیں چار و ناچار خدا کے آگے جھکنا پڑیگا
جو ذرا پوزیشن کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ مگر مجبوری انسان سے سب کچھ کراتی ہے خشک سالی سے
ناک میں دم آگیا ہے، اسواسطے اپنی ناک کو خاک میں رگڑیں گے۔ تاکہ دم خاک میں چلا جائے
اور ہمارا نام آدم کے بدلے جادم مشہور ہو جائے۔

فریاد بکری

منکہ یک گوسفند غریب الدگو سفند حقیر ساکن قتلگاہ دنیا پیشہ بیکسی و بیچارگی دعوی کرتی ہوں
عدالت انصاف خدا پرستی میں بموجب اس دفعہ کے جسکا انگریزی اسم لائبیل اور دیسی اسم ازالہ
حیثیت عرفی ہے۔ اور قانون داں حقایق و دقایق رمز شناس حیات و ممات یعنی ڈاکٹر شیخ
محمد اقبال المخاطب بہ سر الوصال سند یافتہ بیرسٹری و ڈگری یافتہ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ساکن محلہ
مقتول۔ انارکلی کے۔
دعوی یہ ہے کہ مدعا علیہ ذی شان نے حکیم افلاطون و لسان الغیب حضرت حافظ شیرازی کو
گوسفند سے تشبیہ دیکر خلقت کو ان سے حذر و احتیاط کی تاکید کی ہے اور معناً مجھ مدعیہ کی تحقیر و تذلیل کو
بر سر عام شایع کیا ہے۔ اور میری ہزاروں برس کی مذہبی وقعت کو نوک قلم سے ٹھکرایا ہے۔
مجھے اس سے بحث نہیں کہ حضرت حافظ اور افلاطون کی نسبت جو رکیک خیالات ظاہر

کیئے گئے ہیں۔ وہ حق ہیں یا ناحق۔ جا ہیں یا بیجا۔ کیونکہ یہ باتیں اس وقت میں چھاپی گئی ہیں جبکہ ان بزرگوں اور ان سے بڑے بڑے درجے والے پیشواؤں کی علانیہ بیحرمتی کیجاتی ہے۔ ان کے مضحکے اُڑائے جاتے ہیں انکے مقلدین پر نفرت و ملامت کے آوازے پڑتے ہیں اور انکے حمایتیوں کو دین و ملت کا دشمن بیان کر کے نئی نسلوں کو ان سے بیزار کیا جاتا ہے۔

مجھے یاد ہے کہ علامہ شبلی نعمانی نے بقلم کھلا حضرت حافظ کو شراب خوار لکھا ہے۔ میں بیخبر نہیں ہوں کہ علامہ مرحوم کے شاگرد ابوالکلام صاحب نے اجمیر شریف کے متعلق اور عام صوفیائے کرام کے بارے میں مغلظات و شنام نویسی کی ہے۔ میں اس سے بھی خبردار ہوں کہ زمیندار کے موجودہ ایڈیٹر صاحب نے حضرت حافظ کو رقاص بکفر کنے والا خطاب یا ہے۔

پس جب وقت کے اتنے بڑے بڑے لوگ ایک طرف ہوں اور دستار حافظ سربازار اُچھالیں۔ تو کس کی مجال ہے جو سامنے آئے۔ قوم ان کے ہاتھ میں۔ قوم کی آواز انکے ساتھ میں جو چاہیں دلو ئیں اور دماغوں میں اُتار دیں جسطرف انکے قلم کو جنبش ہو گی ساری خلقت اسطرف ہو جائیگی۔ پھر میں غریب بجری اگر حضرت حافظ اور حکیم افلاطون کی حمایت میں کچھ بولوں تو کیا حاصل۔ اسی لئے عرضی دعوے میں اپنے زخم خداپرستی کی کچہری کو دکھانے چاہتی ہوں۔

اقبال نے کہا ہے الحذر از گوسفنداں الحذر، اور زمیندار نے بھی اس کو طغرائے مضمون بنایا ہے۔ میں پوچھتی ہوں کہ اقبال و زمیندار کا حضرت موسیٰؑ پر ایمان ہے یا نہیں جنکی ابتدا میری خدمت سے شروع ہوئی تھی اور میری ہی خدمت کے بدولت خدا نے ان کو دنیا میں عروج اور عقبیٰ میں کمال عطا فرمایا تھا۔ وہ بکریاں چرانے والے موسیٰؑ تھے۔ جن کی قوم نے فرعون کو پامال کیا اور سینکڑوں برس بادشاہت کی۔ موسیٰؑ نے گوسفندوں سے حذر نہیں کیا اور مُراد پائی تم حذر کرو گے تو بامُراد کیونکر ہو گے۔

موسیٰؑ پر ایمان نہیں لاتے۔ کٹے محمدی بنتے ہو۔ سند توریت سے تیوری چڑہاتے ہو تو میں اپنے زلفوں والے داتا محمدؐ کا وسیلہ لاتی ہوں انہوں نے بھی گوسفند سے حذر نہیں کیا بچپن

میں بلکہ یوں کہو کہ دُنیا میں سب سے پہلا کام یہ کیا کہ میری نسل کی پاسبانی کی۔ مجھ کو جنگل میں چرانے لے گئے۔ میری خاطر بیابان کی دھوپ برداشت کی۔ میں ذلیل وحقیر ہوئی مجھ میں کوئی ایسی خرابی ہوتی کہ حذر و احتیاط کا حکم لگتا تو سب سے پہلے وہ حکیموں کا حکیم۔ فلاسفروں کا فلاسفر۔ مدبّروں کا مدبّر ادہر متوجہ ہوتا۔ اور الحذر از گوسفنداں فرماتا۔

جب اقبال وزمیندار موسیٰ ومحمدؐ پر ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں تو بتائیں کہ انہوں نے مجھے اس ذلت وحقارت سے کیوں یاد کیا اور اسطرح عامیانہ توہین کیوں روا رکھی۔

اگر ان کو مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے تو میں عرضی دعویٰ اقتصادی و مادی زبان میں لکھوں گی کہ میں انسانی خصوصًا مسلمانی خوراک کا جزو اعظم ہوں۔ روزانہ اپنے لاکھوں بچے انسان کی غذا پر قربان کرتی ہوں اور تم لوگ قربانی کرنیوالوں سے عشق کا دم بھرتے ہو پھر بتاؤ کہ میری برابر تم میں سے کون ایثار وقربانی کرتا ہے۔ سوائے اس کے کہ لفاظی کے پل بنائے جاتے ہیں۔ اور ان پر سے سوراج اور سیلف گورنمنٹ کے جلوس گزر رہے ہیں لہذا اقتصادی اور مادی اعتبار سے بھی میں حذر وحقارت کے لایق نہیں ہوں پس خدا پرستی کی عدالت سے فریاد ہے۔ کہ میرے اس دعوے پر غور ہو۔ اور ملزموں سے بازپرس کیجائے۔

ضرورت ہے ایک پیری کی!

مرزا قدرت اللہ نے شادی کی نیا گھر تعمیر کیا۔ اسمیں میز کرسی سجائی۔ کمپونڈ میں چھوٹا سا باغیچہ بھی لگایا۔ اسکے لئے مالی رکھا۔ میاں بیوی روزانہ کپڑے بدلتے ہیں۔ دھوبی کی نوکری بھی مستقل ہوئی۔ پانی کا خرچ زیادہ ہے سقہ کو بھی کوٹھی کے احاطہ میں آباد کیا گیا۔ میرزا روزانہ داڑھی منڈاتے ہیں۔ حجّام کو روز روز کہاں بلایا جاتا۔ وہ بھی رات دن کا حاضر باش ہے بیگم صاحبہ نارنگی کے چھلکے پر پاؤں رکھ دیتی ہیں تو چھینکیں آجاتی ہیں۔ کوئی دن بخار کھانسی دردسر سے خالی نہیں رہتا۔ انکے واسطے حکیم اور خود مرزا صاحب کے لئے ڈاکٹر نوکر ہوا ہے۔

کیونکہ ایک کو یونانی علاج پسند ہے اور دوسرے کو ولایتی۔

اب فکر صرف ایک پیر کا ہی جو وقت بیوقت بیگم صاحبہ کو نظر بد کی حفاظت کیلئے دم کر جایا کرے اور کوئی بچہ پیدا ہو تو اسکے تعویذ گنڈے کی خبر رکھے۔ پائنیر میں اشتہار دیا گیا ہے چونکہ اسکی اشاعت خطیب سے زیادہ ہی لہذا اطلاع دیجاتی ہے کہ پائنیر کے ذریعہ کی درخواست پر پہلے غور کیا جائیگا اور برسات کے بعد کوئی عرضی قبول نہو گی کیونکہ غالباً ساون تک بیگم صاحبہ کی زچگی ہو جائیگی اور پیر کی خدمت اسی موقع کے واسطے زیادہ درکار ہے میلے کچیلے پیر درخواست نہ بھیجیں۔ نہ وہ پیر جنمیں حسب ذیل عیب ہوں۔ داڑھی بہت لمبی اور گنجان نہو۔ پان سے نفرت نہو۔ حقہ کے دشمن نہوں۔ کسی کو شراب پیتے دیکھکر اعتراض نہ کریں۔ نماز کے نہ خود عادی ہوں نہ دوسروں کو مجبور کریں۔ روزہ کی لت بھی نہ ہو۔ ہر وقت تسبیح ہاتھ میں نہ رکھتے ہوں۔

تنخواہ سالانہ ۲۵ روپے۔ عید بقرعید پر (انعام) نذر بھی دیجائیگی۔ بیگم صاحبہ ان کی مرید بھی ہو جائیں گی۔ شادی کے موقع پر گھر کے کمینوں اور نوکروں سے زیادہ انکا خیال رکھا جائیگا اور پہلے ان کی نذر و نیاز ادا ہو گی۔

خدانخواستہ گھر میں کوئی موت ہو گئی تو میت کے سب کپڑے اور چالیس دن کا کھانا ان ہی کو ملے گا۔

غرض اس گھر میں ان کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو گی۔ اُمیدوار درخواست میں جلدی کا خیال رکھیں۔ بی۔ اے پاس پیر کو ترجیح دیجائیگی۔

(۲)

ضرورت ہے:۔ اس پیر کی۔ جنکے ابا جان۔ اماں جان۔ خالہ۔ ماموں چچا مرید تھے جو ہمارے ہاں سال کے سال آتے تھے۔ چارپائی پر سرہانے کے رخ بیٹھتے تھے۔ گھڑی گھڑی انکے لئے حقہ بھرا جاتا تھا۔ ایک مرغ روز ذبح ہوتا تھا جسکو حضرت وہی پیر صاحب کھاتے تھے۔

میں بچپن میں پردیس چلا گیا۔ گھر والے سب مر گئے۔ کس سے پوچھوں کہ وہ پیر کون تھے
کہاں کے تھے۔ مجھ کو بھی انکا مرید ہونا ہے۔ کیونکہ اب بوڑھا ہو گیا ہوں۔ بے پیرا شیطان کا مرید
ہو کر مرتا ہے۔ اتنا یاد ہے کہ انکی داڑھی خشخاشی تھی۔ مونچھیں بڑی تھیں۔ صبح اور تیسرے پہر
بھنگ کا پیالہ پیتے تھے۔ مرید کرتے وقت چیلے کو بھی بھنگ پلاتے تھے۔ قوم کے اصل النسل سیّد
تھے۔ بڑی بڑی کرامتیں انمیں تھیں۔ ایکدفعہ انہوں نے صاف کہدیا تھا کہ اب کے بھینس
کٹرا دے گی اور وہی ہوا۔
خبر نہیں کہ وہ زندہ ہیں یا مر گئے۔ کسی اخبار پڑھنے والے کو معلوم ہو تو للہ خبر دینا۔ مجھی
مرید ہونیکی از حد ضرورت ہے اور مرید ہوئے بغیر میرا سخت ہرج ہو رہا ہے۔ واجب جانکر عرض کیا۔

(۳)

اب ضرورت ہو ایک پیر کی۔ بیرسٹر صاحب نے تو جواب دیدیا۔ کہتے ہیں۔ مقدمہ میں کچھ جان باقی نہیں
حکیم صاحب فرماتے ہیں۔ مریضہ کوئی دم کی مہمان ہو۔ دوا بیکار ہے۔ علاج کا وقت نکل چکا۔
تو اب پیر کی ضرورت ہے شاید وہی اپنی کرامات سے ٹوٹی کی بوٹی پیدا کر دے۔
سر رشتہ دار صاحب کی خوشامد کر لی۔ رشوت بھی دیدی آس پاس کے سب مصاحبوں
کی بھی مٹھیاں گرم کر چکا۔ مگر ڈپٹی صاحب تو ایسے ناراض ہیں کہ کسی صورت منتے نہیں معلوم ہوتے
لاؤ کسی پیر کی تلاش کریں وہاں سے کوئی تسخیر کا نقش ہاتھ لگ جائیگا۔
اے حسینہ کیونکر ہو گا تجھ بن جینا۔ اخبار میں اشتہار دیتا ہوں۔ ایک پیر کو دریافت
کرتا ہوں جو چلتا ہوا حب کا تعویذ دیدے۔ اور آہ اے یاد آنیوالی پری تجھ کو اسکی طاقت سے پاؤں
لالہ صاحب نے تو دق کر دیا۔ روز کے تقاضے ہیں۔ نالش کی دھمکیاں دیتے ہیں۔
مکان قرق کرنیکی فکر میں ہیں۔ ایک ایسے پیر کی ضرورت ہے جو دست غیب جانتا ہو یا
گھوڑ دوڑ کا نمبر دار اور سٹہ بتاتا ہو۔ میں قرض کے سبب ایک پیر کا سخت ضرورتمند ہوں
اب کے کرکٹ فٹ بال کے میچ زیادہ ہوئے امتحان قریب تھا کہ شہر میں تھیٹر آ گیا۔ جی

نہ مانا۔ بہت سی راتیں اسمیں غارت ہوگئیں دیکھئے پاس ہوتا ہوں یا فیل۔ بظاہر تو پاس ہونیکی اُمید نہیں ہے لہذا دریافت کرتا ہوں کہ کسی کامل پیر کا پتہ بتایا جائے۔ مجھے دُعا کرانیکی کیلئے ایک پیر کی ضرورت ہے۔

ہائے نوکری تو کہاں ملتی ہے۔ خدا ملجائے۔ حضور نظام کی ملاقات میسر آجائے مگر نوکری نصیب نہیں ہوتی۔ سُنتا ہوں پیروں کی دُعا میں بڑا اثر ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ پیروں کی بڑی بڑی جگہ رسائی ہوتی ہے بس ایک پیر درکار ہے جو دُعا یا سفارش سے نوکری دلوادے

(۴)

خدا نے علم دیا۔ اولاد دی۔ روپیہ دیا۔ پیسہ دیا۔ عزت آبرو دی۔ خطاب یافتہ ہوں۔ بچوں کی شادیوں میں خوب نام حاصل کرچکا ہوں۔ اب ایک ارمان باقی ہے کہ کسی اچھے پیر کا مرید بھی ہو جاؤں اسی لئے یہ اشتہار شائع کراتا ہوں کہ "ضرورت ہے ایک پیر کی"۔

پیر بہت نامور ہو۔ بڑے بڑے جج وکیل۔ انگریزی پڑھے لکھے اسکے مرید ہوں۔ کیونکہ میں خدا کے فضل سے گھٹیا آدمی نہیں ہوں جو ایسے گھٹیا پیر کا مرید ہوں۔ جو دھنے جولاہوں کو مرید کرتا ہو۔

مجھے معلوم ہوا ہے کہ مرید ہونا بھی ہماری سوسائٹی کا ایک فیشن ہے۔ اور مجھ جیسا فیشن ایبل آدمی فیشن کو کبھی ترک نہ کرے گا۔

(۵)

یہ پیر خبر نہیں عام خلقت پر اتنا اثر کیوں رکھتے ہیں سُنا ہے انکو لاکھوں روپئے نذر نیاز ملتی ہے اور بغیر کوشش کئے ملتی ہے۔ خدا کی شان ہے ہماری کانفرنس۔ ہماری انجمن ہمارے کالج ہمارے سکول۔ ہمارے ندوہ کو ہزاروں جتن کرنے پر لوگ چندہ نہیں دیتے اور ان پیروں کو گھر بیٹھے چھنا چھن منی آرڈر بھیجتے ہیں سُنا نہیں جس جلسے میں کوئی پیر چلا گیا اسکو بیشمار چندہ ملجاتا ہے۔

چونکہ کمترین نے بھی ایک اسکول بچوں کی تعلیم اور اپنی ضروریات خانگی کے لئے کھولا ہے اور اس کے واسطے چندہ جمع کرنا چاہتا ہوں لہذا ایک با اثر پیر کی سخت ضرورت ہے کوئی صاحب

بتائیں کہ مذکورہ مقصد کے قابل پیر کہاں دستیاب ہوں گے۔

اے حسن نظامی تو نے پیروں فقیروں کی خرابیاں تو ہزاروں گنوائیں۔ مریدوں کی حالت بھی تو لکھ کہ وہ کن اغراض سے پیروں کے پاس جاتے ہیں اور انکی مریدی کیا شان رکھتی ہے۔ اس واسطے تو نے یہ مضمون لکھا اور مریدوں کی تصویر کھینچکر دکھائی جس زمانہ میں مرید اس قماش کے رہ گئے ہوں ہوقت کے پیروں پر اعتراض فضول ہے۔ بازار میں وہی جنس بکنے آتی ہے جسکی مانگ اور ضرورت ہو پس چونکہ طالب آجکل ایسے ہیں جنکا ذکر اوپر کیا گیا۔ تو مطلوب بھی ویسے ہی ہو گئے ہیں۔

اے مضمون نگار فقرا اور مشائخ پر طعن کرنے سے پہلے تو ان جھوٹے، تماشی بندگان اغراض مریدوں کو ٹھوکریں مار اور ان کی عقیدت کے اجزا کو الگ الگ کر کے دکھا، اور کہہ۔

"اچھے پیر جب ملیں گے کہ طلب اچھی ہو گی۔ خدا والوں کو کیوں ڈھونڈا جاتا ہے۔ کیا متلاشی بھی خدا کے طلبگار ہیں صحاب وق حقانیت کی جستجو کس واسطے ہے۔ کیا جستجو کرنیوالے بھی مقصود حقانی رکھتے ہیں"۔

نہیں ایسا نہیں ہے۔ تو پیر ویسا کہاں۔ مثل مشہور ہے:-

"جیسی روح ویسے فرشتے"

خدا پرستی کا نسخہ

ڈاکٹروں نے ایجاد کیا۔ گرمی گرمی کو مارتی ہے۔ زہر کو زہر اتارتا ہے سنا نہیں چیچک طاعون کے ٹیکے انہی بیماریوں کے زہر سے بنائے جاتے ہیں پھر یہ خدا پرست لوگ نیا علاج کیوں نہیں کرتے۔ میں عیسائیوں آریوں اور مسلمانوں کو اپنی ایجاد جدید سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ وہ لوگوں کو خدا پرستی کی تندرستی اور روح کی درستی عطا کریں اور خدا کی بھول سے بندوں کو بچائیں۔ جو عاقبت شکن مرض ہے۔

قرآن میں خدا نے فرمایا ہے جب بندہ پر مصیبت آتی ہے یا وہ بیمار ہوتا ہے تو خلوص قلب سے خدا کو یاد کرتا ہے اور جب تندرست ہوتا ہے تو ایسا بیخبر ہو جاتا گویا کبھی خدا

سے کام ہی نہ پڑا تھا۔

انجیل و تورات میں بھی انسان کی اس فطری خصلت کا ذکر آیا ہے۔ پس منطقیانہ نتیجہ یہ نکلا کہ آدمی کو بیمار ڈالنا اور مصیبت میں مبتلا کرنا چاہیئے تا کہ خدا پرستی کرے اور خدا سے غافل نہ ہو۔

اس حالت میں پادری صاحبان کو لازم ہے کہ شفاخانے بند کر دیں اور ایسی دوائیں تقسیم کریں جن سے انسان بیمار زیادہ ہوں۔ بیماریاں بڑھینگی تو خدا پرستی بھی ترقی کریگی۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کو بھی لازم ہے کہ وہ کونسلوں میں تجویز پیش کریں اور شہروں قصبوں سے سرکاری اسپتال اٹھوا دیں۔ کیونکہ ان عام دواخانوں نے ہمکو از حد تندرست کر دیا ہے اور اس تندرستی سے ہماری ایمان و رستی میں فرق آرہا ہے۔

فطرت بدلتی رہتی ہے تو ہمکو بھی بدلتا رہنا چاہیئے۔ کیا ضرورت ہے کہ ہم وعظ کہہ کر اپنا دماغ خراب کریں اور کتابیں ہدایت و خدا پرستی کے لئے تصنیف کر کے اپنا روپیہ کھوئیں۔

بہت آسان علاج ہے نہایت مزیدار نسخہ ہے کھلی ہوئی بات ہے جسمیں غور و خوض کی ضرورت ہی نہیں۔ مگر میں کہ اس نسخہ کا موجد ہوں از راہ حفظ ماتقدم عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھ پر اس نسخہ کا تجربہ نہ کیا جائے۔ میں پریشانی و بیماری میں خدا کو اتنا یاد نہیں کرتا جتنا تندرستی میں جھک جھک کر اسکی عبادت بجا لاتا ہوں اور کہتا ہوں۔

اے مولیٰ اس بھول کے عالمگیر زمانہ میں میری یاد قبول کر میں تجھ کو کیونکر بھولوں کہ تیرے احسان اور تیری نعمتیں مجھ کو سر سے لیکر پاؤں تک دبائے ڈالتی ہیں۔ اور تو مجھ کو اسقدر یاد آتا ہے کہ زندگی کے مزے میں کرکراہٹ ہونے لگتی ہے۔ ہر گھڑی خیال یہی کہتا ہے کہ زندگی کے تماشے ہیچ ہیں جو کچھ ہے زندہ خدا کی دید و شنید میں ہے۔

چونکہ میں اس کلیہ سے مستثنے ہوں۔ لہذا مجھ کو بیمار ڈالنے کی کوشش نہ کیجائے واجب جان کر عرض کیا۔

رشتہ یا خدا

جس کو دیکھا نہیں، جو نہ خود سامنے آئے نہ دوسروں کو آگے بلائے اس سے محبت کیونکر ہو۔ اسکے ساتھ مروّت کیونکر برتی جائے۔ اسکا لحاظ کون کرے۔

رشتہ داری بڑی چیز ہے۔ وقت پڑتا ہے تو اپنے رشتہ ہی کے لوگ کام آتے ہیں پسینہ کی جگہ خون بہاتے ہیں۔

رشتہ داری کے مقابلہ میں خدا کی رعایت بہت مشکل کام ہے۔ زندگی دنیا میں ہے اور خدا آخرت میں۔ رشتہ داری زندگی کے ساتھ وابستہ ہے اسواسطے جسکو زندہ رہنا ہو۔ جو زندگی کو پر لطف رکھنا چاہتا ہو۔ اسکا کام تو یہی ہوگا کہ رشتہ کو خدا پر مقدم رکھے۔ جب مرجائیگا زندگی ختم ہوجائیگی۔ اسوقت خدا سے تعلق کرلیا جائیگا۔ جیتے جی تو رشتہ کو نہیں چھوڑا جاتا اور ایک نامحسوس ان دیکھی چیز کی خاطر رشتہ کو توڑنا دشوار ہے۔ مگر دنیا میں ایسے لوگ بھی ہوئے ہیں جنہوں نے خدا کو رشتہ پر فوقیت دی۔ رشتہ سے ٹوٹے۔ خدا سے جڑے۔ خبر نہیں خدا نے ان لوگوں پر کیا جادو کر دیا تھا کہ اس چمکتی دمکتی دنیا میں ان کو سوائے خدا کے کچھ بھاتا ہی نہ تھا۔

مکہ میں ایک خدا کا پرستار

لکھا ہے عرب کے ملک میں ایک شہر مکہ ہے۔ وہاں کوئی صاحب رہتے تھے ان کو خدا نے اپنی اُلفت میں اسیر کرلیا معلوم نہیں انہوں نے خدا میں ایسی کیا بات دیکھی تھی کہ ان کو سوائے خدا کے کسی سے غرض ہی نہ تھی۔ اُٹھتے خدا بیٹھتے خدا۔ سوتے خدا جاگتے خدا۔ سب جانتے ہیں کہ محبت رنگ لائے بغیر نہیں رہتی۔ خدا کی چاہت خالی کیسے رہتی۔ گھر والوں اور کنبہ رشتہ کے لوگوں کو یہ بات گوارا نہ ہوئی اور انہوں نے خدا کے اس شیدائی کو اپنے شہر میں نہ رہنے دیا۔ کچھ اور لوگ بھی انکی دیکھا دیکھی خدا کی محبت کا دم بھرنے لگے تھے۔ یہ مکہ چھوڑ کر بیابان

عشق میں نکلے تو اکیلے نہ رہے۔ بہت سے لوگوں نے ساتھ دیا۔
ان حضرت نے مکہ چھوڑا۔ جوان کا پیارا وطن تھا جسمیں عمر کے چالیس سال بسر کیے تھے۔ گھر چھوڑا۔ جہاں چچا۔ بیٹی۔ داماد اور کنبہ کے سینکڑوں آدمی تھے اور مدینہ نامی ایک سنسان قصبہ میں آن بسے۔

رشتوں کی ڈوری تلوار سے توڑی

اس ترک وطن پر بس نہ کی۔ بدر کے میدان میں اپنے رشتہ داروں سے تلوار چلانے کھڑے ہو گئے۔ صرف اتنی سی بات پر کہ وہ خدا کی محبت سے منع کرتے تھے اور موجودہ وحاضر بتوں کے مقابلہ میں۔ غیر موجود غائب خدا کی چاہت سے روکتے تھے۔
یہ حبیب صاحب نے ملانے ایک بڑی جمعیت کا جو ہتیاروں اور ساز وسامان سے آراستہ تھی اپنے مٹھی بھر ساتھیوں سے مقابلہ کیا۔
یا تو اتفاقی بات یا واقعی خدا ہی نے کچھ کرشمہ دکھلایا۔ کہ یہ حبیب صاحب جیت گئے اور مکہ والے بیچارے چن چنکر تلواروں سے کٹ کر گر پڑے۔ اور جو بچے وہ رسیوں میں بندھ کر مدینہ لائے گئے۔ جہاں یہ حضرت رہتے تھے۔
ذرا خیال کرنا۔ تلوار سے اتنے رشتہ داروں کے سر کاٹ کر بھی انکو رشتہ کا خیال نہ آیا اپنے سگے چچا عباسؓ اور حقیقی داماد ابوالعاص اور خبر نہیں کتنے رشتہ داروں کو قیدی بنا دیکھا اور پروانہ کی۔
ہائے خدا نے ان حبیب صاحب کو اپنے عزیزوں سے کیسا لڑایا تھا کہ رات کو اپنے چچا عباس کی آہیں سنتے تھے کیونکہ انکے ہاتھ میں رسی بہت چبھ رہی تھی۔ مگر رہائی کا حکم نہ دیتے تھے۔ کہتے ہیں۔ دل پر تو انکے بھی اتنا اثر تھا کہ چچا کی تکلیف کے سبب رات بھر نہ سوئے۔ مگر خدا کا دشمن خیال کر کے رشتہ کی پروانہ کی اور چچا و داماد جیسے قیدیوں سے ذرا بھی رعایت نہ فرمائی۔
صبح ہوئی قیدی سامنے لائے گئے۔ تجویز ہوئی کہ سب کے سر کاٹ دئے جائیں۔
اس وقت انکو ترس آیا۔ ایک طرف رشتہ داری انسانی ہمدردی کا خیال تھا دوسری

طرف یہ کہ میرے معشوق خدا کے دشمن ہیں۔ انکا مار ڈالنا ہی اچھا۔

آخر سب عاشقانِ خدا سے رائے لی اور فیصلہ اسپر ٹھیرا کہ فدیہ لیکر چھوڑ دیا جاے۔

بیٹی کی ہیکل

اُف کلیجہ مُنھ کو آتا ہے، خدا نے ایک باپ کو اولاد سے بھی بے پروا کر دیا تھا اپنی اُلفت کی کچھ ایسی برکی ڈالی تھی کہ خدا کے نام کے سامنے کسیکا خیال ہی نہ آتا تھا قیدی رہا ہونے لگے تو ان حضرت کے داماد ابوالعاص کا فدیہ سامنے آیا جو خود ان ہی حضرت کی بیٹی زینب نے مکّہ سے اپنے شوہر کو چھڑانے کیلئے باپ کے پاس بھیجی تھی، یہ وہ ہیکل تھی جسکو خود ان ہی حضرت نے بیٹی کو جہیز میں دیا تھا ہیکل سامنے آئی توانکو وہ زمانہ یاد آگیا جب اپنی آنکھوں کی تارا لاڈلی بیٹی کو بیاہا تھا، اور یہ ہیکل جہیز میں دی تھی۔ آخر بشر تھے رشتہ کی محبت نے ذرا سا اثر کیا بے اختیار آنکھوں میں آنسو بھر آئے دیکھا سامنے داماد رسی سے بندھا کھڑا ہے اور غریب و مفلس بیٹی نے اپنے خاوند کی رہائی کے لیئے میری دی ہوئی ہیکل بھیجی ہے اس بیکس کے پاس سوائے ہیکل کے کچھ نہو گا یہ اسکا پیارا زیور ہے جس سے اسکو بہت محبت ہوگی مگر شوہر کی خاطر اس نے کلیجہ کو مسوس کر یہ گلے کا ہار اُتار کر بھیجدیا۔ بیٹی نے خیال تو کیا ہوگا کہ ایسی بھی کیا بات ہے کہ داماد کو بغیر فدیہ کے باوا جان رہائی نہ دینگے مگر یہ بھی ہونگی کہ وہ تو خدا کی محبت میں رشتہ کی پرواہ بھی نہیں کرتے یہ ہیکل بھیجے بغیر چارہ نہیں۔

مسلمانوں سے خطاب

لوگو ایک تو یہ صاحب تھے جنہوں نے خدا کو رشتہ پراسقدر سختی سے مقدم رکھا اور خدا کے معاملہ میں کسی عزیز قریب کنبہ دار کی پرواہ نہ کی اور ایک وہ لوگ ہیں جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم انہی مدینہ والے عاشق خدا کے پیرو ہیں لیکن جب امتحان کا وقت آتا ہے تو خدا کو چھوڑ دیتے ہیں اور رشتہ کنبہ کی پاسداری کرتے ہیں میں تو جانوں آجکل کے لوگ ٹھیک ہیں۔ اور انہوں نے دُنیا کی قدر جانی ہے۔ ہیچ دُنیا میں محبت کریں خدا سے، یہ کونسی دانشمندی کی بات ہے۔ خدا مرنیکے بعد ہے زندگی میں

اس سے کیا سروکار، مر جائیں گے۔ اسوقت خدا کو بات کو سب پر مقدم رکھیں گے۔
ابتو جیتے ہیں اپنے رشتہ داروں میں دو گھڑی ہنس بول کر وقت گذار لینے دو، کیوں تم
زندگانی کو بے مزا کراتے ہو۔ کہ صاحب سب کو چھوڑ دو اور خدا کو چاہو۔

میں نے ڈر کے مارے ان مکہ مدینہ والے حضرت کا نام نہیں لکھا۔ کیونکہ انکے نام میں
یہ تاثیر ہے۔ کہ جو شخص ایک دفعہ سن لے خدا کا عاشق ہو جاتا ہے، رشتہ کنبہ اور دُنیا کی
باتوں کو چھوڑ خدا خدا بکنے لگتا ہے میں اگر وہ نام لکھ دیتا تو اس مضمون کے پڑھنے والے
ہی بکنے لگتے۔ قربان اس عاشق مزاج کے دل حق پرست کے جس نے اصل پیدا کرنیوالے
کو پیارا بنایا اور سارے اغیار کو ورق خیال سے مٹا دیا۔ خدا ہی اس قابل ہے کہ اس سے
محبت کیجائے، جو کھانیکو روٹی پینے کو پانی۔ سانس کو ہوا سونیکو زمین۔ دیکھنے کو آنکھ
سُننے کو کان بولنے کو زبان دے۔ آدمی اسی کو نہ چاہے تو بڑا احمق ہے اگر وہ نظر نہیں آتا مگر ہے تو وہی ہر نگاہ کا داتا۔

اسی لئے میں نے گول مول ذکر کیا کھول کر نام نہ لیا۔ کیونکہ مجھ کو دُنیا میں رہنا ہے۔ اور جس کو
دُنیا کی زلیست درکار ہو، اسکو کنبہ رشتہ سے دل لگانا چاہئے۔ کہ دُنیا کا مزا ان ہی لوگوں سے ہے۔

میں تو یہ چاہتا ہوں کہ آدمی اپنی خودی سے محبت کرے خدا کا نام کبھی نہ لے خودی ہے
تو جہان ہے۔ زمین ہے آسمان ہے خود نہیں تو کچھ نہیں دم گئے ہیں سب دمدمے۔ جب دم
نہیں تو کچھ نہیں!! دم ہے تو ہم ہیں۔ ہم ہیں تو خودی ہے، خودی ہے تو رشتہ دار جان کے ساتھ
کہ خودی اور ہما ہمی رشتوں کے جڑنے سے پیدا ہوتی ہے،

خدا ہوا۔ تو خودی کہاں۔ خودی نہیں تو دُنیا کی حکومت ہاتھ آئیگی نہ عزت و حرمت۔
نہ عیش نہ آرام، نہ رشتہ داریاں اور نہ گھر واریاں۔

اے خدا اپنی محبت میں ہر آدمی کو گرفتار نہ کیا کر۔ تو اس آخرت کے وعدے کرکے جہاں
ہمیشہ رہنا ہے کیوں دُنیاوی مزوں کو کرکرا کرتا ہے اور کیوں ایک ایسی لمبی زندگانی کی امید
دلاتا ہے جسکا کبھی خاتمہ ہی نہو گا۔ انسانوں کے دل اس غیر فانی حالت سے اکتا نہ جائیں گے۔

اتبو رشتہ جوڑنے دے۔ دُنیا کی برادری بننے کی اجازت مرحمت کر۔ تیری محبت بہت ہو چکی کبتک بھولے بھالے آدمیوں سے کہوائیگا۔ خدا خدا خدا۔ رشتہ کچھ نہیں۔

مسلمان جب پاگل ہوتا ہے

تو اسکی بڑ کیا ہوتی ہے۔ کم سے کم ہندوستان کے پاگل خانوں میں اسکا تجربہ کرنا چاہیئے۔ میں نے مختلف صوبوں اور شہروں کے پاگل خانے محض اسی عرفان کی خاطر دیکھے اور نتیجہ یہ نکالا کہ مسلمان جب پاگل ہوتا ہے تو اسکو امام مہدی یا پادشاہ وقت ہونیکا وہم ہوتا ہے ہر وقت اسکی زبان سے یہ بڑ نکلتی رہتی ہے کہ میں ملک کا بادشاہ یا موعودہ مہدی ہوں۔

مُسلمان کی فطرت میں حکومت اور سرداری خمیر کیگئی ہے قرآن نے جسدن اس سے کہا "و انتم الاعلون" تم سردار ہو، تم بلند مرتبہ ہو، تم اونچے ہو، اسی دن سے مسلمانوں کی خصلت میں سرداری شامل ہوگئی۔ اب وہ پاگل بھی ہوتا ہے تو بادشاہی کا خیال ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔

مُسلمانوں کا معشوق بھی جنگی ہے "انکی شاعری کے معشوق کو دیکھئے ہتیاروں کا پتلا نظر آیگا اس سے بھی اس قوم کے جذبات کا اندازہ ہوتا ہے کہتے ہیں تیر نظر، کمان ابرو۔ تیغ نگاہ"

آجکل الہ آباد میں اسی قسم کے ایک پاگل کا ظہور ہوا ہے، انہوں نے خطوط چھپوائے ہیں جنپر انکی تصویر ہے آج ایک خط ہمارے ہاں درگاہ میں بھی آیا تھا لکھا ہے یہ تصویر تعویذ ہے جو اپنے پاس رکھیگا دین دُنیا کی مرادیں پائیگا۔ یہ تو اشتہار نویس ہشیار رجنوں ہے اس کے بعد تصویر کے آس پاس جو فقرے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسلمانوں کے عام مرض میں مبتلا ہیں۔ ایک طرف لکھا ہے، شاہ ولایت۔ ایک جانب تحریر ہے قطب وقت، ایک رخ درج ہے ابوالوقت۔ ایک سمت میں ہے امام مہدی،

بچوں کی خصلت دیکھا کرتے تھے کہ بنیہ کا بچہ دکان کا کھیل کھیلتا ہے پیرزادہ کا بچہ کھیل میں پیر گدڑ کا عرس کرتا ہے جولاہے کا بچہ تانا بانا۔ اور حجام کا بچہ جھوٹ موٹ کا استرا لیے پھرتا ہے

اب بڑوں کے کیرکٹر آزمائے جاتے ہیں۔ دُنیا کی ہر قوم ایک عجوبہ ہے قدرت کی نیرنگی کا اور مسلمان ان سب میں عجیب تر ہیں ان میں ہر مہدی ہاتھ رنگ سکتا ہے، اور ہر قسم کی مہدویت کامیاب ہو سکتی ہے۔ خواہ کیسی ہی بے جوڑ ہو۔

حدیثوں میں بنی فاطمہ کے مہدی موعود کا وعدہ آیا ہے۔ ہندوستان میں ان چنگیزیوں کی نسل نے مہدی موعود کا دعویٰ کیا جو بغداد میں لاکھوں سادات بنی ہاشم کو تہ تیغ کر چکے ہیں۔ مگر ان میں دعوے بھی ناکام رہا۔

ڈاکٹری خواہ کتنی ہی ترقی کرے ناقص رہے گی۔ جبتک وہ انسان کے دماغ کے قومی خصائل کی رو سے تحقیقات نہ کرے اور نتائج نہ نکالے۔

دیکھئے الہ آباد کے مہدی صاحب جو ابوالوقت بھی ہیں ان بچوں کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں جو ابن الوقت کہلاتے ہیں۔ رشتہ میں تو یہ لوگ ان کے پوتے ہوئے مگر جس دادا کے پوتوں سے یہ ساری دُنیا بھری ہوئی ہو اسکی کامیابی میں تو کوئی شبہ نہیں ہے کیونکہ دُنیا آجکل سب کی سب ابن الوقت ہے اور اسکو قدرتاً اپنے دادا ابوالوقت کا ساتھ دینا ہوگا

عید کی چھینک

آپ چھیں۔ آپ چھیں۔ شکر الحمد للہ۔ یرحمک اللہ۔ یہدیک اللہ و یصلح بالکم۔ آپ چھیں آپ چھیں اب کچھ نہیں۔ یہ تو زکام کی چھینک ہے گھڑی گھڑی الحمد للہ الحمد للہ نہیں کہونگا جسکے جواب میں دوسرا یرحمک اللہ کہے اور مجھ کو دوبارہ یہدیک اللہ و یصلح بالک کہنا پڑے، کمبخت دیسی عطر میں یہ بڑی خرابی ہے۔ نزلہ پیدا کرتا ہے۔ عید کا دن ہے۔ غسل کیا آدھے تازے آدھے باسی کپڑے بدلے۔ لکھنؤ کا عطر لگایا۔ اب عیدگاہ جاتا ہوں مگر چھینکیں آئے جاتی ہیں آپ چھیں۔ ایسی حالت میں نماز کیونکر پڑھوں آپ چھ۔ افوہ چھینک رُک گئی ہنسی بھی آتی ہے اور غصہ بھی۔ یہ کیا موقعہ نزلہ کا تھا۔

ناک پوچھنے کا رومال خریدنا پڑیگا مگر یہ تو نئے لوگوں کی تقلید ہے۔ میں اپنے کرتے یا اچکن کے دامن سے پوچھ لوں گا۔ کیا ضرورت ہے کہ دو آنے رومال میں خرچ کروں کہتے ہیں کہ چھینک خدا کی رحمت ہے، دماغ کا بخار اس سے اتر جاتا ہے۔ جب ہی تو خدا مسلمان سے الحمد للہ کہواتا ہے۔

کیسی مشکل ہے۔ روٹی کھاؤ تو خدا کا شکر کرو۔ پانی پیو تو خدا کا شکر کرو۔ سوؤ جاگو پیدا ہو مرو۔ بیمار ہو۔ تندرست ہو۔ ہر وقت خدا کا ٹھکیس ضرور دو۔ حد ہے کہ چھینک آئی منہ کھلا آنکھیں بھر بھرائیں کلے کی کھال اوپر کو سمٹی، ناک کے نتھنے ذرا کھینچے اور سر نے ایک زور کا جھٹکا کھایا ایسی مصیبت تھی کیسی بے اختیارانہ حرکت تھی اسپر خدا کا شکر خدا کا ٹکیس موجود ہے یہ عید کا دن ہے میں بکرا دیدونگا اور کچھ نہیں دیتا۔ خدا اپنے نزلہ اور چھینکوں ضبط کر لے مجھے ان کی پرواہ نہیں ہے میرے پھیپھڑے میں ناٹک کا گیت تھا اس چھینک کے ہچکولے سے سانس کے بھونچال میں خبر نہیں کہاں گر پڑا چھینک کا کیا گیا۔ میرا نقصان ہو گیا۔ خدا کرے آج حاذق الملک بہادر کو بھی بہت سی چھینکیں آئیں۔ ناک سنکتے سنکتے ناک میں دم آجائے کیونکہ مجھے توقع ہے کہ پھر وہ چھینکوں اور نزلہ کا نسخہ بنا دیں گے اور آئندہ عید کے دن کسی کو چھینک نہ آیا کرے گی۔ آآچھیں چھیں۔ اے ہے نزلہ۔

روح کی فروخت

کہتے ہیں نیا زمانہ مادی ہے روح اور روحانیات سے بے خبر ہے۔ مگر اسکا ثبوت مانگو تو نہیں دیسکتے۔ صرف اتنا کہتے ہیں کہ آجکل ہر ترقی کی بنیاد مادیت پر ہے اور انتہائی نتیجہ مادیت کا نکلتا ہے۔ میں نے اسکی نسبت شیخ الملاؤمین عارف منکرین ارواح مسٹر ڈاروِن سے پوچھا تو انہوں نے اپنے مقام فلسفہ سے یہ جواب بھجوایا۔

میری عبادت گزار دنیا روح سے جتنی واقف ہے تم ارواح پرست لوگ اسکی گرد کو بھی نہیں

پہنچ سکتے۔ میرے مومنین روح کی تجارت کرتے ہیں خود اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ تم روح کو فائدہ پہنچانا چاہتے ہو۔ ہندو یا مسلمان اپنے بزرگوں کی ارواح کو کھانا کپڑا نقدی خیرات کے ذریعہ بھجواتا ہے اگر تمنے روح سے تعلق رکھا، اور ارباب روحانیت کہلائے تو خود تمہاری ذات کو کیا فائدہ ہوا۔

اصل روحانیت ہماری ہے کہ روح کو گرفتار کرکے فروخت کرڈالتے ہیں اور اسکے داموں سے اپنی روح کو تروتازگی دیتے ہیں۔

غور کرو نئے زمانہ میں الماس کی روح نکالی اور یونانی حکیموں کے جلابی قدح اسکے سامنے مات ہو گئے۔ خوشبو کی روح نکالی اور لکھنؤ و قنوج کی ارواح پرستوں سے جو خوشبو کا جسم فروخت کرتے تھے ہزاروں میل آگے بڑھ گیا۔ ان دو پر کیا حصر ہے نئی روشنی نے تو ہر چیز کی روح بدنوں سے نکالکر بازار میں بکنے کو بھیجدی ہے پرانی روشنی کہے کہ میرے بدن میں جان ہے تو کوئی نہ مانیگا کیونکہ اسکا دم بھی مدت ہوئی مشین کشش ارواح سے کھینچ کر نکال لیا گیا۔

حق یہ ہے کہ اصل روحانی لوگ یہی نئے زمانہ والے ہیں جنکی روح تابعدار ہے نہ کہ ہم کہ روح کے محکوم بنے ہوئے ہیں قرآن میں خدا نے فرمایا ہے اطاعت کرو خدا اور رسول کی اور امر والوں کی لوگ جھگڑتے ہیں کہ امر والے سے مراد بادشاہ وقت ہے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ امر سے مراد روح ہے۔ کیونکہ قرآن ہی میں خدا نے فرمایا ہے کہ روح امر رب ہے تو معلوم ہوا۔ کہ خدا نے اطاعت اولالامر کے حکم میں اصحاب روحانیت کو مراد رکھا ہے اور روحانیت نئی زمانے کے اوپر ثابت ہو گئی پس نتیجہ نکلا۔ کہ ہم سب کو نئی روشنی کی اطاعت حکم خدا سے واجب ہے اگر ہم بھی ارواح کی تجارت کرنے لگیں تو روحانی بن جائیں۔

اخبار ہمدم کو چاہیئے کہ کاغذ کی روح نکالنے پر غور کرے۔ کاغذ مہنگا ہو گیا ہے روح اس کی خوب بکیگی۔ اور ہمدم ان اسٹاف روحانیوں کا پیشوا بنجائیگا۔ قدرتاً بھی اس کے نام میں دم یعنی روح موجود ہے۔ تہری چیز زفار سہرڈ اردن۔

بابِ دُوُم

اُمورِ تمدن و معاشرت

لکھنؤ کی کیل

جرمن کی ہر کیل سے چھوٹی ہوتی ہے مگر بڑی ہی کھوٹی ہوتی ہے - جرمنی کی کیل میں جہاز مخفی ہیں لکھنؤ کی کیل خود پان میں پوشیدہ رہتی ہے - لکھنؤ میں رواج ہے کہ پنواڑی پان کی گلوری میں لوہے کی کیل لگا دیتے ہیں جو اکثر انجان و اجنبی آدمیوں کے مُنہ کو زخمی کر دیتی ہے - میں نے پان کے بیڑے سے پوچھا - تجھ میں اتنی شرارت کیوں ہے؟ اس نے کہا اس لیے کہ انسان ہر چیز کو دیکھ بھال کر کھائے اور غفلت کی عادت کو چھوڑے، بے دیکھے کھائیگا تو سزا پائیگا - یہ سنکر تجویز ہوئی کہ آئندہ روٹی میں سوئیاں پکانی چاہئیں - تاکہ کھانیوالے ہر نوالے کو غور و احتیاط سے کھائیں اور اکل حلال تک رسائی پائیں -

مقتول کا رقص

کل میدان جنگ میں ایک مقتول تڑپتا تھا - میں نے اسکے سر کو اپنے زانو پر رکھا - اور اس کے رقاص جسم کی بہار دیکھی - ملک الموت نے کہا اسکو میری گود میں دیدو میں نے کہا ٹھیرو ذرا اس کے رقص کی سیر تو کر لوں - فرشتہ بگڑا اور بولا کوئی اپنی جان سے جاتا ہے آپکو اسمیں مزا آتا ہے

میں نے کہا بھائی ہر قوم کا ایک رقص اور اسمیں ایک لطف ہے، صوفی باطنی تلوار سے مجروح ہو کر ناچتا ہے۔ اور زخمی ظاہری تیغ سے دونوں میں ایک ادا ہے۔ مرنے والے نے کہا ناچنے کا لفظ صوفی کی توہین ہے میں بولا سب مہذب ناچتے ہیں۔ بادشاہ اور بیگم تک اس لفظ پر عمل کرتے ہیں پھر صوفی کو رقص میں کیا مارہے۔ تہذیب مادی ہو یا روحانی دونوں کا ایک ہی شعار ہے۔

ساربان ابن ساربان

تمہارے خاقان ابن خاقان و سلطان ابن سلطان کا ہم قافیہ ساربان ابن ساربان میں اونٹ چلاتا ہوں۔ اونٹ کی محنت پر میری زندگی کا دار و مدار ہے۔

دیکھو میرے پیچھے اونٹوں کی ایک قطار چلی آتی ہے۔ ہر اونٹ کی نکیل دوسرے کی دم سے بندھی ہوئی ہے اور بیچارا چپ چاپ گردن جھکائے آگے والے اونٹ کے قدم بقدم چلا آتا ہے۔ راستہ میں ایک منطقی صاحب ملے تھے۔ بولے کیوں بھئی اونٹو! تمہاری پیٹھ پر کیا لدا ہوا ہے اور تم کہاں جاتے ہو۔ سب نے کہا اسکی خبر ہمارے ساربان ابن ساربان کو ہے اس نے جو کچھ لاد دیا ہے۔ ہمنے لاد لیا ہے۔ وہ جہاں لے چلے گا وہاں چلے جائیں گے۔

منطقی نے کہا تم کو معلوم کرنا چاہئے تھا کہ کہاں کا ارادہ ہے اور پشت پر کیا چیز لادی ہے۔ یہ سنکر ایک اونٹ نے کیا خوب جواب دیا کہ آپکے کالجوں اور سکولوں میں جو شتر زادے کتابوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے اور ایک دوسرے کی دم سے بندھے جارہے ہیں ان سے بھی کبھی پوچھا کہ کہاں جاؤ گے اور تم پر کیا لدا ہوا ہے۔

تمکو پہلے اپنے گھر بلو شتران بے مہار کی خبر لینی چاہیئے اسکے بعد ہم جانوروں تک آنا۔ منطقی صاحب لاجواب ہو گئے اور اونٹ ساربان ابن ساربان کے پیچھے بڑبڑاتے چلے گئے۔

اس وقت میں نے خیال کیا کہ اس ہمینی گفتگو کے اندر ایک پھانس ضرور تھی۔ وہ دل کہاں سے لاؤں جو اس کو دل لگی نہ سمجھے۔ اور غور کر کے کچھ نتیجہ نکالے۔

چھری کانٹے کی تکفین

موت تو مجھ کو یاد آئی ہے۔ آپ چھری کانٹے کے کفن دفن کا عنوان کیوں مقرر کرتے ہیں۔ آیئے چھری کانٹے کا خیال چھوڑیئے اور مجھ کو اوّل منزل پہنچایئے۔

صاحب میں چند گریجوایٹ لڑکوں کا اتفاقی باپ ہوں۔ اتفاقی اس لیے کہ وہ ناخلف اکثر اپنے دوستوں سے کہا کرتے ہیں کہ اتفاقی امر ہے کہ ہم اس وحشی کے گھر میں پیدا ہو گئے ہیں۔ بڑا ہی بے تمیز اور ناشائستہ ہے۔ اس ترقی کے زمانہ میں ابتک پان کھاتا ہے رُوئی کی کمری پہنتا ہے دستر خوان پر ڈکار لیتا ہے انگلیاں شوربے میں ڈبوتا ہے اور پھر انکو چاٹتا ہے۔ گھر کی اونچی اونچی دیواریں بنا کر ہوا روکتا ہے مٹی کے ڈھیلے سے استنجا کرتا ہے ہماری بدقسمتی ہے کہ اسکے بیٹے بنے۔ کاش یہ ہمارا باپ نہ ہوتا۔

بھائیو میرے یہ چاروں بیٹوں کا خیال ہے۔ ایک بھی ان میں سے مجھے اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔ ذرا انصاف کرنا میں نے ان کی تعلیم میں اپنی ساری کمائی خرچ کر دی۔ سَو روپیہ کا نوکر تھا۔ چار سَو روپیہ کی آمدنی تھی وہ سب کی سب انکے پڑھنے میں جھونک دی۔ آپ روکھی سوکھی کھائی۔ موٹا جھوٹا پہنا۔ کوڑی کوڑی بچائی۔ پیسہ پیسہ جوڑا اور انکو علی گڑھ میں پڑھوایا۔ یہ خیال تھا کہ ہم بڈھے ہونگے تو یہ بڑے بڑے عہدے پائینگے اور ہماری خدمت بجا لائیں گے۔ انپر خرچ کرنا گویا بنک میں روپیہ جمع کرنا ہے۔ ایکدن مع سود کے وصول ہو جائیگا مگر قصور کچھ میرا بھی ہے۔ انکے ہوش سنبھالتے ہی انگریزی سکول بھیجدیا۔ چاہیے تھا کہ پہلے قرآن شریف پڑھواتا۔ مذہبی مسائل سے آگاہ کرتا۔ بزرگوں کے ادب آداب اور خدمت کے طریقے بطور تربیت کے ذہن نشین کرتا پر مشکل یہ تھی کہ راتدن علی گڑھ والوں کے لیکچر سنتا تھا

کہ دیسی مکتبوں میں ڈالکر اور بے سر و پا کتابیں پڑھوا کر عمر برباد کر دیجاتی ہے۔ ان بیچاروں کا دماغ تو پہلے ہی قرآن یاد کرنے میں خرچ ہو چکا ہے۔ اسکولوں اور کالجوں میں آکر وہ کیا خاک ترقی پائیں گے۔ اس لیئے ضرورت ہے کہ شروع ہی سے ان کو انگریزی میں لگایا جائے تاکہ چال ڈھال میں ابتدا سے انگریزیت کا اثر قائم ہو جائے۔

میں بدنصیب ان لیکچراروں کے جادو میں آ گیا۔ اور ہائے میں نے کچھ آگا پیچھا نہ دیکھا میں نے اپنے چار نونہال برباد کر دیئے۔ لوگو! میں لُٹ گیا۔ میری اولاد اور مال دونوں ہاتھ سے گئی اس پر طرہ یہ کہ ان کو دیکھ دیکھ کر جی جلتا ہے ان کی باتوں سے طبیعت کھولتی ہے لیکن کیا کروں کچھ بس نہیں چلتا۔

ایک صاحبزادے جج ہیں ۹ سو پاتے ہیں۔ دوسرے انجنیر ہیں سات سو کی تنخواہ ہے تیسرے۔ ای۔ اے۔ سی۔ چار سو کے تنخواہ دار ہے۔ چوتھے کمیٹی کے سکرٹری ہیں دو سو ماہوار اور بالائی یافت الگ۔ خرچ دیکھو تو الاماں۔ ایک بھی ان میں ایسا نہیں جو مہینے پر دو پیسے بچا سکتا ہو تنخواہ آنے میں جب چار دن رہ جاتے ہیں تو انکی گزر قرض پر ہونے لگتی ہے نہ انہوں نے کوئی زمین مول لی ہے نہ مکان خریدا ہے نہ کوئی ایسا کپڑا بنایا ہے جو بازار میں فروخت کرنے جاؤ تو آدھے دام تو ملجائیں۔ نہ انکے پاس ایسے برتن ہیں جنکی چوتھائی قیمت وصول ہو سکے حیران ہوں کہ یہ ہزاروں روپے کہاں غارت ہوتے ہیں مجھ کو نہ دیں تو آپ تو فارغ البال رہیں جب سنتا ہوں خرچ سے تنگ سنتا ہوں لہٰذا میں نے تیاری کر لی کہ مر جاؤں چنانچہ بادل نخواستہ مر گیا خیال تھا کہ میری مرنے میں یہ ضرور آئیں گے۔ آخر کو انکا باوا ہوں ضرور دل پسیجے گا۔ مگر افسوس میں اپنی جان سے گیا تب بھی یہ آرزو پوری نہ ہوئی ایک لخت جگر نے مرنیکی خبر سنکر اپنی ماں کو تار دیا۔ بہت افسوس ہوا مجھ کو صاحب نے رخصت نہ دی اس لیئے میں نہیں آ سکتا۔

دوسرے کا تار آیا آج میرے ہاں دوستوں کی دعوت ہے آنیکی فرصت نہیں۔ باقی دو نے بالکل گھنی سادہ لی۔

اس پُرانے زمانے والی عورت کو دیکھو۔ اس نے مجھے ایک رات دن پڑا رہنے دیا۔ کہ میرے بچےؔ آجائیں۔ تو کفن دفن ہو

بڑے لڑکے کو پھر تار دیا گیا۔ تو اسوقت تشریف لائے جبکہ محلہ کے رضائی اُوڑھنے والے یعنی داڑھیاں لٹکائے میرے جنازہ کو قبرستان لئے جاتے تھے۔ صاحبزادے صاحب گھر میں آئے چُرٹ مُنہ سے نکالکر ماں سے کہا۔ ماما سے کہو چار بنائے۔ راستہ میں بہت سردی تھی۔ ماں بولی بٹیا باپ کو قبرستان لیجاؤ موئی چار کا خیال چھوڑ دو۔ یہ سُنکر نور چشم نے تیوری چڑھائی اور فرمایا میں کسی کے لئے اپنی تندرستی خراب نہیں کر سکتا۔

آخر لوگوں کے سمجھانے سے میت کے ساتھ ہوئے مگر کندھا نہ دیا نہ لاش کے قریب آئے کیونکہ ان کو چھوت لگجانیکا ڈر تھا۔ بلکہ لوگوں سے کہا کہ جنازہ گلیوں میں سے لیچلو کیونکہ ان کو شارع عام پر چلنے سے شرم آتی تھی کہ سوائے انکے مجمع میں کوئی پتلون پوش نہ تھا پس ایسے ناشائستہ گروہ کے ساتھ چلنا انکی انسلٹ تھی جس کو توہین بھی کہتے ہیں۔

قبرستان جاکر محلہ والوں نے آواز دی کہ آپ میت کو قبر میں اُتاریئے۔ یہ آپکا فرض ہے اُنہوں نے کہا۔ نو۔ نو۔ ملازم لوگ اُتاریگا۔ میں ان کو انعام دے گا۔

مسلمان مُسکراکر چُپ ہو رہے اور اُنہوں نے مجھے قبر میں کھینچ کر ڈال دیا۔

اب صاحبزادے گھر تشریف لائے اور ماں سے کہا گھر کے سب کپڑے جلادو مکان میں سفیدی کرادو ماں بولی اَے وہ کیوں! بلند اقبال نے جواب دیا اس لئے کہ بیماری کی چھوت جاتی رہے۔

ماں نے کہا نا با با مجھ سے یہ نہو گا۔ کپڑے ان کی نشانی ہیں میں انکو آنکھ سے اوجھل نہ ہونے دوں گی۔ اور نہ سفیدی کرانے کا یہ موقع ہے۔ کوئی کیا کہے گا کہ مرتے دیر نہ ہوئی۔ اور ان کو آرائش کی سوجھنے لگی۔

اس جواب سے نونہال کو بڑا غصہ آیا اور رات کو ہوٹل میں جاکر سوئے اور صبح کو نوکری پر چلے گئے

ہائے میں ناحق مرا۔ کاش نہ مرتا اور اپنی بڑھیا کو خاک بسر نکرتا۔ اس غریب کا کیا حال ہو گا

نئی روشنی کی اولاد سے توقع نہیں ہے۔ اے لوگو! جو اس بیان کو پڑھتے ہو۔ اگر تم اپنے بچوں کو انگریزی پڑھاؤ، تو پہلے ان کی مذہبی تربیت اچھی کر دینا اور ان کو ماں باپ کے حقوق بچپن میں سکھا دینا۔ ورنہ یاد رکھو کہ ان کے چھری کانٹے تمہارے گوشت پوست کو کاٹ کاٹ کر کھا جائیں گے۔ اور تمہارا بھی وہی حال ہو گا جو میرا ہوا۔

قبر میں بھی چین نہیں جس اولاد کی خاطر رشوت لی تھی۔ وہ اولاد ایسی نکمی نکلی۔ اور رشوت کے عوض سانپ بچھو مجھے لپٹے۔

لعنت ہے میرے کردار پر لعنت ہے میری غفلت پر۔ اور نفرت اس تہذیب جدید پر مگر یہ لعنت و نفرت محدود ہی۔ کیونکہ نہ سب بیٹے ایسے ہوتے ہیں اور نہ سب مجھ جیسے باپ۔

سات سو پچاس ناقص کانگریس میں

جسکے آدھے بھی ناقص ہوتے ہیں اور وقت ضرورت نہ کام آسکتے ہیں نہ سند ہو سکتے ہیں۔

مسٹر پریسیڈنٹ لیڈیز اینڈ جنٹلمین۔ جو کانگریس کے پنڈال میں حاضر تھے مجھ کو معاف کریں۔ کہ میں انٹی کانگریس کی حیثیت سے نہیں۔ بلکہ ایک کٹ ملانیم وحشی کی پوزیشن سے کانگریس کی اس کامیابی پر تنقید کرنی چاہتا ہوں جسکی مسٹر واچا نے بہت تعریف کی ہے اور جس کو ملک کی خوش نصیبی سے تعبیر کیا ہے۔

اور وہ یہ ہے کہ ابکے کانگریس میں سات سو پچاس عورتیں بھی شامل تھیں۔

ہم لوگ عورتوں کو ناقص العقل کہتے ہیں۔ لہذا کہنا چاہیئے کہ ساڑھے سات سو ناقص العقل اس مجمع کاملین میں موجود تھے۔ مگر ہنوز یہ معلوم نہیں ہوا کہ ووٹ لیتے وقت ان ناقص الکاملین کو بھی درج شمار کیا گیا یا نہیں۔ اگر نہیں کیا گیا تو ہوم رول حاصل کرنے کے بعد انڈین سفرجیٹ ایجیٹیشن کے حفظ ماتقدم کی کوئی تجویز پاس ہوئی یا نہیں۔ کیونکہ جب ابتدا میں عورتوں کو اسقدر دلچسپی کانگریس سے ہے تو وہ وقت دور نہیں۔ جبکہ

لیڈی لیگ

قایم ہوگا۔ اور مردوں سے مساوات کے حقوق طلب کیئے جایئں گے۔

ہوم رول لیگ کی تجویز پاس ہو یا نہو۔ لیکن عورتوں کی سیاسی دلچسپی سے توقع ہوتی ہے کہ ہندوستان میں ہوم رول زیادہ فروخت ہوا کریں گے۔ کیونکہ تعلیم یافتہ عورتیں مردوں کے قلم کا مقابلہ بغیر رول اٹھائے نہ کر سکیں گی۔

خصوصًا اس حالت میں کہ مسز اینی بسنٹ نے ہوم رول کا مسئلہ اُٹھایا ہے اور بسنٹ صاحبہ باعتبار جسم عورت ہیں پس مستورات کہہ سکتی ہیں کہ ہوم رول عورتوں کی سعی سے ملا ہے لہذا عورتوں کا حق مردوں سے دگنا ہونا چاہیئے۔ ایک مردوں کی برابری میں دوسرا اس صلے میں کہ عورت نے ہوم رول حاصل کیا۔

کیا معلوم نہیں کہ مرد سالہا سال سے کانگریس کے خیمہ میں غل مچایا کرتے تھے۔ کچھ شنوائی نہ ہوئی۔ بسنٹ دیوی کھڑی ہوئیں تو ہوم رول مل گیا۔

ہم جاہلوں کے عقیدہ میں تو عورتوں کا مردوں کے برابر آنا نہایت خطرناک ہے۔ سرکار کو چاہیئے کہ وہ اسکولوں کالج کے طلبا کی طرح عورتوں کو بھی پالٹیکس کی شرکت سے منع کردے۔ ورنہ سوشل اور خانگی انتظامات میں بہت خلفشار پڑ جایئں گے۔

آسمانی چوڑیاں

کانگریس ہتھیار مانگتے مانگتے تھک گئی۔ اور اس کو ایک چاقو بھی نہ ملا۔ مستانوں نے چوڑیاں مانگیں تو کوئی محروم نہ رہا۔

لیگ و کانگریس کے نمایشی مردان مستانوں کو زنانہ کہیں گے۔ کہیں، جو مُنہ میں آئے بکیں، مستانِ الست ان دعوے داران مردمی کو کب خاطر میں لاتے ہیں۔ کیونکہ انکو نظر آتا ہے کہ ان سب کے ہاتھ آسمانی سہاگ کی چوڑیوں سے ننگے ہیں۔

ذرا دیکھو ان متوالوں کو، جن کو آسمانی سہاگ کی چوڑیاں ملی ہیں۔ اپنے پیا اپنے سیّاں اپنے ساجن اپنے پتی پر کیسا توکل رکھتے ہیں۔

یہی اعتماد انکا سہاگ ہے۔ پیا کو چاہتے ہیں۔ پیا انکو چاہتا ہے۔ وہ ساجن انکے گھونگٹ کی لاج رکھتا ہے اور اس لاج کو بچانیکے لئے تلوار کھینچے کھڑا رہتا ہے۔ لیگی اور کانگریسی رنڈاپے کی صورتوں کو بھی دیکھنا۔ ہر ہر گھر کی آبادی کو دیکھکر ٹھنڈا سانس بھرتی ہیں۔ پرائے ہاتھ کی مہندی مانگتی ہیں۔ دوسروں کے شوہروں پر جان دیئے دیتی ہیں۔

اے آسمانی چوڑیاں پہننے والی سہاگن روحوں خبردار رہنا اپنے واحد و یکتا خاوند کے سوا کسی غیر کا خیال دل میں نہ لانا۔ ورنہ تم بھی لیگ و کانگریس کی بیواؤں کی طرح ہرجائی بن جاؤ گی اور تمہارا پتی تم سے بیزار ہو کر آنکھیں پھیر لیگا جیسا کہ اس نے ان بیگیوں سے نظر اٹھالی اور بمبئی میں ساری رسوائیاں ان پر ختم کر دیں۔

واہ واہ واہ، کیا ہی پیاری ہیں آسمانی چوڑیاں۔ عاشق کو معشوق بناتی ہیں معشوق کو عاشق دلواتی ہیں۔ سہانی ہیں۔ رنگیلی ہیں۔ البیلوں کی نویلی ہیں۔ لے لو آسمانی چوڑیاں پہن لو آسمانی چوڑیاں۔

بسنتی جسم پر ان آسمانی چوڑیوں کی بہار ہے۔ آؤ جی بہنو یہ پھول بے خار ہے۔ خدا کا تم پر پیار ہے۔ مانگو مانگو آسمانی چوڑیاں۔

مرچ نامہ

پرانا قلعہ ہی نہ رہا جہاں کی لال مرچیں دلی میں مشہور تھیں اور پھیری والے کنجڑے پرانے قلعہ کی آواز لگا کر مرچیں بیچا کرتے تھے۔ کہنے کو قلعہ اب بھی موجود ہے لیکن اسکے آس پاس کی زمین جہاں مرچوں کی پیداوار تھی نئی دلی کے نقشے میں آگئی۔ اور کہیں کیاری کا نقشہ قلعہ کے قریب بالکل مٹ گیا۔

خدا کی مار منہ میں آگ لگ گئی۔ آنکھیں پانی میں ڈوب گئیں۔ یہ سالن ہے یا مرچوں کا اچار۔ دلی والے خبر نہیں اتنی مرچیں کیوں کھاتے ہیں۔ دکن مدراس اور دلی کے سوا ساری دنیا میں مرچوں کی اتنی زیادتی نہیں ہے۔ کہیں تو کالی مرچوں کا رواج ہے کہیں ہرے سے مرچ کھاتے ہی نہیں مگر دلی الٰہی تیری پناہ۔ سالن میں لال مرچ نہ ہو تو دلی والے اس کی صورت پہ نام دھرتے ہیں۔ نیلی پیلی شکل بناتے ہیں۔

دلی والے ہری مرچیں پا روکھی کھاتے ہیں۔ نیبو میں کتر کر کچومر بناتے ہیں۔ اچار میں ڈالتے ہیں۔ لال ہو جائے تو دال سالن اس ہی سے پکتا ہے۔ سالن کی لال لال رنگت کی تعریف کی جاتی ہے۔ جو مرچ کی تیزی سے ہر وقت سرخ رہتا ہے۔

لال مرچ کا پودا

دو ڈیڑھ فٹ اونچا مرچ کا درخت ہوتا ہے۔ ڈالیاں گنجان پتے ٹہنی کی برابر نوک دم۔ مرچ شروع میں بڑی پیاری معلوم ہوتی ہے۔ انگل بھر کی سبز چکنی پاؤ انچ موٹی جڑ کی طرف سے چوڑی منہ کے پاس سے پتلی زمین کی طرف آنکھیں جھکائے ٹہنی ہی چند روز میں بڑھتے بڑھتے دو انچ ڈھائی انچ کی لمبی ہو جاتی ہے۔ بچپن کی سبزی جوانی کا سرخ لباس پہنتی ہے اور ہرے ہرے درختوں میں لال لال مرچیں ایسی معلوم ہوتی ہیں جیسے سبز ساٹن میں لال لال پھول یا روشنی کے سبز جھاڑ میں سرخ رنگ کی قلمیں لٹکا کرتی ہیں۔ بیچارا درخت تو اول سے آخر تک سبز ہی رہتا ہے۔ خبر نہیں مرچ میں یہ جوانی کہاں سے آجاتی ہے کہ مرتے دم تک لال رہتی ہے۔ شاید مرچ کے درخت کا جگر بھی لال ہوگا اور اس نے اس کو کاٹ کر مرچیں بنائی ہوں گی۔

مرچیں ٹوٹ کر آتی ہیں تو ڈوروں میں پرو کر اور ہار بنا کر یا یونہی چھتوں اور سوکھی زمین پر پھیلا کر انکو سکھا لیتے ہیں۔ پھر کیا مجال دھوپ سے اس کے رنگ و روغن میں فرق آتا ہو سوکھ کر مرجھا جاتی ہے مگر چہرہ ویسا ہی لال دمکا کرتا ہے۔ بلکہ کھال میں ایک

طرح کی چمک اور شفافی پیدا ہو جاتی ہے جسمیں سے اسکے اندر کے بیج نظر آیا کرتے ہیں۔

مرچ کے پیٹ میں بہت سے بچے یعنی بیج ہوتے ہیں اور ان کی شکل زرد اور گول گول بالکل سونے کی گنیوں کی سی ہوتی ہے۔

مرچ کے نقصان

مرچ کھانے کی چیز نہیں ہے۔ اسکو تو کھیت میں دیکھنا چاہیئے۔ مگر خلقت کھاتی ہے لال مرچ معدہ کو جگر کو۔ مثانہ کو۔ دل و دماغ کو بیحد مضر ہے۔ مردوں کے مخصوص امراض اسی لال مرچ سے پیدا ہوتے ہیں۔ مرچ انسان کو اندھا کر دیتی ہے۔ اسکا نقصان بہت آہستہ آہستہ ہوتا ہے اور معلوم نہیں ہوتا۔ مرچ بھی افیم اور شراب کی طرح منھ کو لگ جائے تو مشکل سے چھوٹتی ہے۔

مجھی کو دیکھو اسکے ولدادوں میں ہوں۔ آٹھ دن ہوئے بالکل چھوڑ دی ہے اور دیکھتا ہوں کہ اسکے ترک نے میری صحت کو بیحد فائدہ پہنچایا۔ لیکن حالت یہ ہے کہ "فراق مرچ میں مجبور ہوا جاتا ہوں" وہ لال جوڑے والی جسکے سر پر سبز رومال بندھا تھا ہر وقت نظروں کے سامنے رہتی ہے۔ کھانا سامنے آتا ہے تو روح اس کے دیکھنے سے انکار کرتی ہے اور پتیلی کی لال پری کے بغیر نوالہ حلق سے نہیں اترتا۔

کچھ ہی ہو۔ بات ہے تو سب کچھ ہے۔ اب تو جو عہد کر لیا خدا نے چاہا تو اس فتنی کو کبھی منھ نہ لگاؤں گا۔ ہندوستانی ہوں مگر بائیکاٹ میں ہندوستانی نہیں ہوں۔ جو کہتا ہوں اس سے ایک پیچ ادھر ادھر نہیں ہوتا۔

بی مرچ کو چھوڑ دیا۔ طلاق دے دی۔ برسوں ساتھ رہی تھی اس واسطے اس کی یادگار میں یہ مرچ نامہ لکھا ہے کہ مجھ کو بے وفا نہ کہے۔

مرچ کی صوفیانہ شان

ذرا دل کے مسالہ کا بھی خیال رکھنا۔ جو بات کہو جو لفظ زبان سے نکالو صوفیانہ نکتہ

اس میں ضرور تلاش کرو۔ مرچ کی وداع کے وقت میں نے اس پر بھی عمل کیا اور سوچا تو واہ واہ مرچ کی عجیب ادا پائی۔ انسان کے افعال اس کے لباس کی تبدیلی سے بدلجاتے ہیں۔ عمدہ لباس تکبر سکھاتا ہے۔ ادنی لباس خاکساری کی طرف لیجاتا ہے۔

مگر مرچ جب ہری تھی سبز کپڑے پہنتی تھی۔ جب بھی اس میں تیز مزا تھا۔ اور جب متوالی ہوئی، لال برقعہ پہنا۔ اسوقت بھی تیز رہی۔ تر تھی جب بھی تیز، خشک ہوئی جب بھی تیز آدمی زمانہ کی طپش سے کملاتا ہے۔ تو خدا کو بھول جاتا ہے۔ اپنے اخلاق حسنہ کو مٹاتا ہے مرچ ایسی نہیں ہے۔ اور شروع سے آخر تک مستقل زندگی بسر کرتی ہے اور یہی استقلال یہی یک حالی ثبوت ہے۔ اس بات کا کہ مرچ ایک خدا رسیدہ پھل ہے اور مغروروں کی ناک میں اسکی دھانس گھسکر وہی کام کرتی ہے جو مچھر نے نمرود کا کیا تھا۔

مرچ میں مفید خواص بھی ہیں اگر اسکا استعمال قدرت کی ہدایت کے موافق ہو۔ ورنہ وہ شان قہاری کا بناتی ظہور ہے۔

لال رنگ کی یاد

چمن میں گل لالہ نہ رہا۔ بہار سے لال رخ اٹھ گیا۔ چہرہ پر ذراسی سرخی رہ گئی تھی کیونکہ غربت کے سبب اکثر پیدل چلتا تھا۔ ان کو ٹریم کار نے کھودیا۔ اسقدر جانا ہو تو ۱۲ منٹ ٹریم وے کی راہ دیکھتا ہوں۔ سوچتا ہوں میرا چہرہ زرد کیوں ہوتا جاتا ہے۔ گالوں کی لالی دن بدن گھٹتی چلی جاتی ہے۔

ڈاکٹر انصاری سے پوچھوں؟ انہوں نے تو لال ٹوپی۔ لال خیال۔ لال منہ کے ترکوں کا علاج کیا۔ شاید وہ اس کی وجہ بتائیں۔ مگر ان سے بات کرنے کے چار روپے لگتے ہیں۔ "حاذق الملک" سے دریافت کروں تو وہ گھر پر نہیں ملتے۔ سفر میں زیادہ رہتے ہیں۔ خدا کی شان ہے جو لال قلعہ کے نیچے رہے۔ اندلس کی الحمرا کی دید کا عاشق ہو۔ وہ

اپنے بدن کی لالی سے بھی محروم کردیا جائے۔

بازار میں جاتا ہوں پنجرے میں لال بکتے دیکھتا ہوں۔ ان کی لال چونچ سے خدا کی حمد برستی پاتا ہوں۔ مگر وہیں زرد چہرے آدمیوں کے نظر آتے ہیں۔

پوچھو۔ کیوں بھئی لال جانوروں میں تم زرد آدمی کیسے؟ کہتے ہیں لڑائی نے لال رنگ مہنگا کردیا۔ چالیس گنے دام بڑھ گئے ہیں۔ اب ہمارے لئے نہ لال پگڑیاں ہیں نہ عورتوں کے واسطے لال دوپٹے۔ لباس لال میسر نہیں تو جسم کے اوپر سُرخی کہاں سے آئے۔

دلی میں نئی سڑکیں بنتی ہیں تو ان پر لال بجری بچھائی جاتی ہے کہ چلنے والوں کا دل اس "سُرخ دید" سے خوش ہو۔ میدان جنگ میں بہادر خون کی سڑکوں پر پھرتے ہیں تو باغ باغ ہوتے ہیں "تم" لال بجری پر چلو۔ اور جی خوش کرو۔

"لالی" پیروں کے تلے ہے تو کیا لطف۔ مزا تو جب ہے کہ بدن میں لالی ہو۔ چہروں پر سُرخی ہو۔ اور یہ کھانے پینے کی بیفکری سے ہوتی ہے۔ اتفاق واتحاد سے ہوتی ہے۔ یہاں گرانی کے سبب پیٹ بھر اور روٹی نصیب نہیں ہوتی، اور اتفاق کیسے ہو۔ خون بھی تو سفید ہوگیا ہے۔ البتہ ایک وجہ خوشی کی پیدا ہوئی ہے مگر وہ بھی چند دن کی مہمان نظر آتی ہے۔ لڑائی کے بعد کاغذ سستا ہوجائیگا تو کافور ہوجائیگی۔ اور وہ ملکی اخباروں کی سُرخروئی ہے۔ جس اخبار کو دیکھو لال رنگ کے کاغذ پر چھپتا ہے۔ باطن میں سب کے پھوٹے مگر ظاہر میں سب ایک معلوم ہوتے ہیں۔ لال گھوڑا۔ لال جوڑا۔ مگر خود سوار کالا نیلے ہاتھ پاؤں کا۔

کہتے ہیں محرم کے خون نے شفق کو لال بنادیا۔ میں نے بھی محرم نامہ لکھا ہے۔ دیکھو اسکا اثر میرے منہ پر بھی آتا ہے۔ یا میں آسمان کے کناروں سے بھی گیا گزرا رہتا ہوں۔

دل کے خوش کرنے کو غالب نے خوب اشارہ کیا کہ میاں درد ہو۔ تو عشق کے علم بردار ہو دیکھتے نہیں نظام حیدرآباد نے ڈاکخانہ کے صندوق الخطوط لیٹر بکس کا رنگ بھی زرد رکھا ہے۔ چہرہ زرد ہوگا تو چین و جاپان کے ملکوں میں ایک نہ ایک دن تمکو بھی حصہ ملیگا۔ کیونکہ ان ملکوں کے

باشندے سب زرد ہیں۔ ہمرنگی کی مثال گورے شخصوں میں یہی ہے کہ ریل کی گاڑیاں تک ان کو مخصوص ملتی ہیں تو کیا تمہارے زرد چہرہ کی رعایت جاپانی اور چینی نہ کریں گے۔

لیکن میرا دل اس بے جوڑ بات سے خوش نہیں ہو سکتا۔ میں تو لال رنگ کی یاد کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑوں گا کہ "لالہ" سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔

انارکسٹ چیونٹی

دغابازی سے جو ستانے انارکسٹ ہے۔ مجھے خبر ہوتی کہ لال چیونٹی کے ہاتھوں مجھ کو اسقدر اذیت ہو گی تو میں لال رنگ کی صورت سے بیزار ہو جاتا۔ حالانکہ میں نے پرسوں اسکی یاد میں ایک الفت نامہ لکھا تھا۔

لال چیونٹی بہت خطرناک جانور ہے۔ سنتے ہیں لارڈ کچنر بلی سے ڈرتے تھے۔ اگر انکو لال چیونٹی سے سابقہ پڑتا تو وہ بلی سے زیادہ اس منحوس جانور کو بائیکاٹ کرتے۔

کالی چیونٹی دبتی ہے تو کاٹ کھاتی ہے نہیں تو بے غرض اپنی معاش کی تلاش میں دوڑتی پھرتی ہے۔ یہ موذی نمل الاحمر "سرخ چیونٹی" خواہ مخواہ انسان کی دشمن ہے۔ آتی ہے اور چپکے چپکے گردن میں یا بغل میں جا کر اپنا زہریلا ڈنک مارتی ہے۔ ڈنک کیوں کہوں وہ تو منہ سے کاٹتی ہے کمبخت میں ایسا زہر ہے کہ دوڑا ڈالدیتی ہے جس سے غریب آدمی بہت دیر بے کل رہتا ہے۔ اس سے پوچھو کہ بغل یا گردن سے تجھ کو کیا عداوت ہے۔ پاؤں کو چھوڑ کر وہاں کیوں جاتی ہے۔ مگر جواب کیا دے گی۔ انارکسٹ کا شیوہ یہی ہے کہ چھپ کر حملہ کرے بغل اور گردن انسان کو نظر نہیں آتی۔ اسواسطے یہ شریر فتنی نظروں سے اوجھل ہو کر وار کرتی ہے حدیث شریف میں آیا ہے کہ آخر زمانہ میں تمکو چھوٹے قد چپٹی ناک کے دشمنوں سے مقابلہ کرنا پڑے گا۔ جنکی جوتیاں بالوں کی ہوں گی۔

میں تو کہتا ہوں۔ ہو نہ ہو وہ دشمن لال چیونٹی ہے۔ دیکھو نا قد بھی چھوٹا ہے۔ ناک بھی

چپٹی ہے اور جوتیاں بھی بالوں کی ہیں کیونکہ اس کے پاؤں بال جیسے ہیں۔
مصیبت آسمان سے آتی ہے اس پر ان لوگوں کا یقین نہیں ہے جو آسمان ہی کو نہیں مانتے مگر میں ان کو قرآن انجیل۔ توریت۔ وید اور تعزیرات ہند کی قسم کھا کر یقین دلاتا ہوں کہ میرے ہاں لال چونٹیوں کی مصیبت آسمان ہی سے برستی ہے شاید چھت سے گرتی ہوں مگر چھت بھی آسمان کے تحت ہے۔
بکمال ادب محکمہ سی آئی ڈی سے درخواست ہے کہ وہ میرے گھر کے شریر انارکسٹوں کا کچھ بندوبست کر دے جنہوں نے میرے امن میں ناواجب اور وحشیانہ مداخلت کر رکھی ہے اور میں ان سے عاجز آ گیا ہوں۔

چراغ گُل کردو!

عشق کا علاج

دُنیا کی آدھی تکلیف عشق کے سبب ہے عشق نے انسانوں کی آدمیت کا ستیاناس کر دیا طاعون اور ہیضہ کی طرح عشق کے بھی کیڑے ہوتے ہیں جو ایک آدمی سے دوسرے آدمی میں پہنچ جاتے ہیں۔ عشق کی بیماری کم نہیں ہوتی۔ بڑھتی ہی جاتی ہے۔
طبیب کہتے ہیں عاشقی جنون کی ایک قسم ہے۔ جنوں کا بھی خاص خاص حالتوں میں دورہ ہوا کرتا ہے یہی حال عشق کا ہے۔ اسکی ترقی بھی موسموں پر منحصر ہے جن میں برسات کو بہت بڑا دخل ہے جہاں برسات آئی بادل آئے بجلی چمکی۔ ابر گرجا اور عشق اُبلا۔ عاشقوں کا کلام اُٹھا کر دیکھو ہر عاشق برسات میں جیسی بے قراری اور بیچینی کا اظہار کرتا ہے اور کسی موسم میں اتنا نہیں اسکا کیا سبب ہے، سائنٹیفک اور فلسفیانہ طریقے سے اس پر غور ہونی چاہیئے تاکہ غریب انسان اس موذی مرض سے نجات حاصل کرے۔
بنگال کے ایک ڈاکٹر نے دریافت کیا کہ پودوں میں جان ہوتی ہے تو اسکو سب نے انعامات دیئے اسکی واہ واہ ہوئی۔ حالانکہ انسان کے ذاتی وجسمانی فائدہ کی اس معلومات میں

کوئی بات نہیں ہے۔

میں نے جو عشق کی نسبت معلومات حاصل کی ہیں وہ بہت مفید ہیں۔ اور آدمی ایک عظیم الشان تاریخی مرض سے بچ سکتا ہے۔ اگر میرے بتائے ہوئے راستہ پر وہ چلے۔

میں دیکھوں گا۔ کون کون لوگ میری اس تحقیقات کی داد دیتے ہیں۔ مگر مجھے امید نہیں ہے کہ ایک شخص بھی میری اس محنت کی طرف متوجہ ہوگا۔ کیونکہ میں نے بنگالی ڈاکٹر کیطرح انگریزی نہیں پڑھی۔ ڈاکٹری کا امتحان نہیں دیا۔ کوٹ پتلون نہیں پہنتا۔ پھر مجھے کیا حق ہے کہ ایجاد واختراع اور معلومات سائنس کے زمرہ میں دخل دوں۔ کیونکہ بغیر لوازمات مذکورہ کے کوئی آدمی نئی بات معلوم کرنے کے قابل نہیں ہو سکتا۔

خیر اگر کوئی میری تعریف نہ کرے نہ سہی۔ میں تو ملک کے سامنے اپنی دریافت جدیدہ واکتشاف عجیبہ پیش کئے دیتا ہوں۔ اور وہ یہ ہے کہ:۔

برسات کے کیڑے عشق کا مرض پھیلاتے ہیں۔ یہ کیڑے ہیں جو رات کو چراغوں اور لیمپوں پر دیوانہ وار آیا کرتے ہیں۔ یہ اصل میں آتے تو ہیں اپنے مرض عشق کی خاطر مگر ان کے اثر سے ہمارے گھروں میں بھی عشق پھیل جاتا ہے۔ لہذا ضرورت ہے کہ برسات میں کوئی شخص چراغ نہ جلائے۔ سب لوگ اندھیرے میں رہا کریں۔ اگر چند سال اس پر عملدرآمد ہوگا تو دنیا سے مرض عشق جاتا رہے گا۔ دنیا سے نہ جائے تو کم از کم انسان تو اسمیں مبتلا نہوا کریں گے کیونکہ عشق پھیلانیوالے کیڑے جنگل میں رہیں گے روشنی نہو گی تو آبادی میں نہ آئیں گے۔

یہ گھر میرا یا چڑے کا!

حضرت سلیمان علیہ السلام کو ان جانوروں سے کچھ محبت ہوگی۔ مجھے تو ان کی شرارتیں ایک آنکھ نہیں بھاتیں۔ جب دیکھو ایک نہ ایک سر پر موجود۔ کبوتر صاحب ہیں غٹرغوں غٹرغوں کرتے چلے آتے ہیں۔ لوٹڑو صاحب ہیں۔ ٹر ہر ہر وں ٹر ہر ہر وں ہر دوں بنکارتی ہیں صحن میں اگلنی

پھرتے ہیں۔ آگے آگے بیگم صاحب ہیں پیچھے پیچھے گلا پھلائے دم جھکائے نواب صاحب ہیں۔ ان کی دل لگی ہوتی ہے یہاں جی کو خفقان ہوتا ہے۔

اور کبوتر تو اسقدر گھسا گھنا ہے کہ جو دیکھتا ہے۔ غریب سید کہتا ہے کرتوت کی خبر نہیں۔ اس طاق میں جا اس طاق میں بیٹھ یہاں پھڑ پھڑا دیا او دھم مچا کسی پہلو قرار نہیں۔

میں نے کئی دفعہ کہا۔ بھائی یہاں ٹوٹے مقبروں اور کھنڈروں کی کیا کمی ہے جو تم میرے سر پر چڑھے آتے ہو۔ جاؤ وہاں جا کر انڈے دو، بچے نکالو اور دنیا میں اپنی بیٹ کے انبار لگاؤ مگر کون سنتا ہے، وہ تو جان بوجھ کر آتے ہیں۔ ان کو تو ایک سکوت پسند کے ستانے میں مزا آتا ہے۔

سب سے زیادہ بدذات یہ چڑا ہے غسل خانہ میں گھونسلا بنایا کرتا تھا ابکے میں نے کہا میاں یہ موروثی جگہ نہیں ہے۔ اس دفعہ کہیں اور جا کر رہو۔ سنے کون عذر یہ کہ آدمی کی بولی نہیں سمجھتا۔ سب کچھ سمجھتا ہے۔ اشارے تک جانتا ہے مگر یہ خیال کرتا ہے کہ میاں ننھی ننھی جانوں کو مار کر کھا جانیوالے مسلمان نہیں ہیں جتنا بھی سر چڑھ ہوں، کچھ نہ کر سکیں گے۔ غسل خانہ کو ذرا دیکھو۔ تو طاق میں سے صابن پھینکا کھلی پھینکی۔ ٹب میں بیٹ کی، لوٹے میں غوطے لگائے اور تولیہ کا تو دشمن ہے سارے تاگے نکال ڈالے اور اپنے موذی ابن موذی فرزند ارجمند کے نیچے لیجا کر بچھا دیئے۔

خیر میں نے صبر کر لیا۔ بچوں کا خیال کر کے چپ ہو گیا۔ وہ بڑے ہو کر اڑے تو ان حضرت نے دوسری تیاری شروع کی۔

ارے بھائی کیوں دنیا کی آبادی بڑھاتا ہے۔ تجھے کیا ان چڑیا زادوں کو لڑائی پر بھیجنا ہے۔ نہیں مانتا۔ گھونسلے میں تنکے اوپر جمع کئے جاتا ہے۔

آج آٹھ دن ہوئے میں نے غسل خانہ بند کر دیا۔ دروازے کو بند دیکھ کر یہ دونو خصم جورو کچھ دیر تو چڑچڑاتے رہے اور پھر اڑ کر چلے گئے۔ میں نے کہا چلو پاپ کٹا۔

دیکھتا کیا ہوں۔ چڑے صاحب پھر موجود۔ عورت ذات ناک والی تھی۔ وہ تو نہ آئی اور دور کی بندش کو لیڈی کی انسلٹ (توہین) سمجھکر اس نے ادہر کا رُخ نہ کیا لیکن چڑا بیچارا مغرب تک غُل مچاتا رہا۔ سورج چھپا تو جھٹ گیری میں جا گھسا۔ یہ خیال نہ کیا۔ چڑیا رات کے وقت کہاں چلی گئی نازک زمانہ ہے اکیلا چھوڑنا ٹھیک نہیں مگر اسکو ملک (گھر) کی پڑی ہوئی تھی بیوی کی اس نے پروا بھی نہ کی۔ صبح ہوئی تو چڑیا ایک اور چڑے کے ساتھ آئی۔ اور منڈیر پہ بیٹھ کر چڑ چوں چڑ چڑ چوں چوں کی آواز لگائی۔ یہ بے غیرت بلبلا کر دوڑا اور چڑیا کے برابر جا بیٹھا۔ یہ نہ پوچھا کہ کیوں ری ساتھ میں کون ہے اور رات تو نے کہاں گذاری مگر نہیں پھر وہی راز۔ وہی نیاز۔ رقیب چڑا اڑ گیا اور تھوڑی دیر کے بعد چڑیا بھی غائب ہوگئی۔ اب پھر میری شامت آئی۔ سامنے آن بیٹھا اور لگا طرح طرح کی آوازیں نکالنے۔ لڑتا ہے۔ گالیاں دیتا ہے کوستا ہے آخر تو کیا کہتا ہے۔ میں غسل خانہ تو ہرگز نہ کھولوں گا۔

میں نے بھی ایسا مستقل مزاج نہیں دیکھا برابر آٹھ دن اس نے ایجی ٹیشن جاری رکھا اور آج ۲۳ نومبر ۱۹۱۶ء یوم پنجشنبہ کو بوقت عصر میں نے اپنی ضد کے ہتھیار چڑے کے سامنے ڈالدیئے اور غسلخانہ کھولکر اس کو گھونسلے میں جانے کی اجازت دیدی۔

تم لوگ اس بحث میں وقت ضائع کر رہے ہو کہ کانفرنس کے پریسیڈنٹ آنریبل محمد شفیع ہوں یا نہوں میری خبر کوئی نہیں لیتا کہ یہ گھر میرا رہا یا چڑے کا اور آیا اس گھر میں رہنے کی اسکو اہلیت ہے یا مجھ کو۔ ہائے تم میں سے کس کو اس واقعہ حاضرہ سے دلچسپی ہوگی۔

پلے کون کون کرتے تھے

چڑیاں چوں چوں کرتی تھیں۔ قمری ہوں ہوں کرتی تھی۔ مرغی قوں قوں کرتی سردی آئی تھی میں نے گرم لحاف اوڑھا تھا پاؤں پھیلا کر سویا تھا کتے کے

پلے گلی میں پڑے ٹھٹھرتے تھے انکی کوں کوں کی آواز سے میری نیند اُڑ گئی۔ میلی کچیلی گیلی زمین میں کتیا اپنے بچوں کو لئے پڑی تھی بچے اپنی ماں کے پیٹ کے سایہ میں آپس میں لپٹے ہوئے کوں کوں کر رہے تھے۔ سردی الکوستاتی تھی۔ ذات پات کی قید نے اسپر بھی یہ مصیبت ڈالی تھی۔ وہ ادنیٰ ذات کی نہوتی۔ خدا اس کو اچھی شکل دیتا تو آج کسی کوٹھی کے اندر نرم نرم بچھونوں میں آرام کرتی ہوتی پچھلے جنم کے اعمال اسکے سامنے آئے ہیں۔ اچھوت ذات میں پیدا ہوئی آپ بھی دُکھ سہتی ہے بچوں کو بھی دُکھ میں دیکھتی ہے دیکھنا بیچاری کتیا کیسی دُبلی ہو گئی ہے۔ ساری بستی میں ہڈیاں چھوٹے ٹکڑے تلاش کرنے جاتی ہے کہیں سے ملجاتا ہے اور کہیں سے جوتی اینٹ پتھر یا گالیاں کھاتی ہے اسکو بھوک کی زیادہ پرواہ نہیں ہے مگر بچوں کے دودھ پلانے کے سبب اس کو اندنوں بھوک بہت لگتی ہے کھانے کو میسر نہیں آتا۔ بھوک میں دودھ پلاتی ہے تو اسکا جسم گھُل گھُلکر آدھا ہوا جاتا ہے۔ دن میں کسی ظالم نے پتھر مارا ہوگا ٹانگ اُٹھائے اور لنگڑا لنگڑا کر چلتی ہے اب رات کو وہ چوٹ اسکو ستا رہی ہے۔ بچوں کی کوں کوں کے ساتھ وہ بھی کبھی ایک لمبی کوں کر لیتی ہے۔

پلّوں کے اندر ایک بے گناہ روح ہے خوبصورت اور اعلیٰ نسل کے پلوں کی ارواح اور ان کم نسلے پلوں کی روح میں کچھ فرق نہیں ہے پھر وہ کیوں عیش کرتے ہیں۔ میم لوگوں کی گود میں سوتے ہیں۔ صابن سے نہاتے ہیں۔ گائیکا دودھ اور گوشت انکی غذا ہے۔ اشرف المخلوق انسان انکی غلامی پر مقرر ہے جو انکو کھلاتا پلاتا نہلاتا ہوا خوری کراتا ہے اور اسکے عوض اپنے انسانی بچوں کی پرورش کے لئے تنخواہ پاتا ہے اور یہ کم نسلے اس مصیبت میں کیوں ہیں۔ تناسخ اور آواگون ماننے والے کہیں گے کہ انکا پچھلا جنم برے اعمال پر ختم ہوا تھا اس واسطے اس جنم میں ان کو تکلیف اُٹھانی پڑی۔ جو پچھلے گناہوں کا بدلہ ہے۔

جو آواگون نہیں مانتے وہ کہیں گے کام بڑی چیز ہے اعلی النسل کے کتے شیر کا مقابلہ کرتے ہیں اپنے مالک کے نمک پر جان دیدیتے ہیں اسواسطے انکی جتنی قدر ہو تھوڑی ہے اور یہ کم نسلا کتا تو بڑا ہی کاہل ہے رات دن بھونکتا ہے نیند خراب کرتا ہے اور خطرہ سامنے دیکھے تو دُم دباکر بھاگ جاتا ہے۔ ایسے ڈرپوک کا یہی علاج کہ وہ تکلیفیں اُٹھائے اور اور جھڑ و ذلیل رہے میں تو نہ ادھر ہوں نہ اُدھر مجھے تو بیکس اور غریب سے محبت ہے اسواسطے ان بچارے پلوں کی تکلیف نہیں دیکھ سکتا اور کہتا ہوں۔ آ کُور۔ کُور۔ کُور۔ آؤ بچوں میں تمہیں اپنی لحاف میں بٹھاؤں میں تمہیں اپنی اونی جانماز پر سلاؤں۔ تم گندے سہی مگر میری نمازیں تم جیسے بیکسوں پر قربان ہو جائیں ایک دل کی پاسداری ہزار نماز سے بہتر ہے اور تم تو کئی ننھے ننھے دل رکھتے ہو۔

ال کچہری

یہ اَل بھی کچہری سے دامن بچائے کھڑا ہے۔ اسکو بھی کچہری سے ڈر ہے۔ یا چھوت لگ جائیگا اندیشہ ہے۔ کیونکہ اَل عربی نژاد ہے۔ ہندی کچہری سے احتیاط اسکا قومی فرض ہے مگر کیا کرے اشارہ کرنیکو جسطرح انگریزی میں دی کی ضرورت پڑتی ہے مسلمان اَل کو حرف اشارہ سمجھ کر کام میں لاتے ہیں۔

اَل کہتا ہے وہ کچہری۔ اس اشارہ میں بڑی بلاغت ہے بڑی ظرافت ہے۔ کیونکہ کچہری کو ہم لوگوں نے جھوٹ بولنے کا ٹھکانہ بنا رکھا ہے۔ بڑے بڑے ثقہ لوگ جن کی ساری عمر سچ بولنے میں صرف ہوتی ہے۔ کچہری میں جاکر جھوٹی گواہی دے آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کچہری میں سچ کیونکر بولیں۔ یہ اَل اسکا اشارہ کرتا ہے۔ یعنی وہی کچہری جس میں جبہ وعمامہ کو جھوٹ جائز ہے۔

جغرافیہ ہر کچہری کا سارے ملک میں ایک ہے۔ کچہری ایک جزیرہ ہے جس کے آس پاس عقل وتدبیر کے پہاڑ ہیں اور پھر قانون کے سمندر۔

کچہری میں قانون انصاف کے تخم بوتا ہے مگر اہل مقدمہ اپنی چالاکیوں کا کھاری پانی دیکر اس بیج کو ہرا نہیں ہونے دیتے اسلامی حکومت کے زمانہ میں بھی کچہری کا یہی حال تھا اور مجھ جیسے دیوانے لوگ قاضیوں کے چٹکیاں لیا کرتے تھے۔

کچہری کے جراثیم

ڈاکٹروں نے ہر جسم میں کیڑے دریافت کیئے ہیں وہ ہر مرض کا سبب جراثیم یعنی کیڑوں کو بتاتے ہیں۔ کچہری بھی ایک ہستی ہے ایک وجود ہے ایک جسم ہے اسکے بھی جراثیم ہیں اور وہ وکیل بیرسٹر اور مختار ہیں۔ کچہری کا مرض ان کیڑوں سے پیدا ہوتا ہے۔

جسنے کبھی کچہری کی شکل نہ دیکھی ہو وہ کسی وکیل یا بیرسٹر سے ملاقات پیدا کرے ایک ہی دفعہ کا ملنا اسکو کچہری کا شایق بنادیگا کیونکہ اسمیں کچہری کے کیڑے گھس جائیں گے۔

ان کیڑوں کا ابتک کوئی علاج دریافت نہیں ہوا۔ یہ کیڑے ملک کے اچھے اچھے آدمیونکو بیمار کردیتے ہیں۔ کچہری کا مریض اور عشق کا بیمار ایک ہی حالت رکھتا ہے عاشقی کا مرض بھی آدمی کو گھن کی طرح کھاجاتا ہے اور کچہری کی بیماری بھی انسان کا کام تمام کردیتی ہے کچہری کا چاہنے والا کاسیلی اور حسین آنکھ سے بیزار ہوتا ہے اسکو کسی معشوق کے قد زیبا اور سخن شیریں کی ہوس نہیں ہوتی وہ دفعات قانون کے ہندسوں پر مرتا ہے تعزیرات ہند کی کتاب اسکے لیئے نامہ محبوب ہے اسی کو سینہ سے لگاتا ہے اسی کو چوم چوم کر جی ٹھنڈا کرتا ہے۔

کچہری کا دلدادہ مسٹر ایل ایل بی۔ کی گلی میں سو سو پھیرے کرنے میں ایک لذت پاتا ہے اسکی جان میں جان آجاتی ہے جب وکیل یا بیرسٹر صاحب کی زبان سے مقدمہ کی سرسبزی کا کوئی جملہ سن لیتا ہے کچہری کا بیمار مرتے وقت صرف ایک ہی آرزو کرسکتا ہے کہ اسے کسی قانون پیشہ آدمی کا چہرہ دکھادو یا کم سے کم اس کے گھر کا سائن بورڈ دیا کام کا تختہ ہی منگادو۔

کچہری کے مبتلا کو جب موت آتی ہے اور اس کے آس پاس کلمہ پڑھا جاتا ہے

تو اس کے کانوں میں یہ آواز آتی ہے۔

کوئی صفدر بیگ حاضر ہے!!!

اور وہ فوراً حاضر حاضر کہتا ہے اور گھبرا جاتا ہے لوگ سمجھتے ہیں فرشتے اسکے سامنے آئے ہیں اور خدا کی حضوری کا پیام لائے ہیں کیسا نیک اور جنتی ہے کہ منھ سے حاضر حاضر نکلتا ہے

کچہری کا دیوانہ اخبارات میں کسی خبر اور مضمون کو نہیں پڑھتا۔ اسکی نظر مقدمات کے اشتہاروں پر ہوتی ہے اور جب کسی اخبار میں اپنے مطلب کی خبر نہیں دیکھتا تو کہتا ہے کہ یہ اخبار بالکل نکما ہے اور کام کی بات تو اس میں ایک بھی نہیں۔

کچہری کے شوقین جواریوں۔ شرابیوں، اور تماش بینوں سے زیادہ اپنی شوق کے پکے ہیں۔ وہ مقدمہ بازی کسی حق کی خاطر نہیں کرتے انکو تو جوئے اور شراب کیطرح کچہری کی ایک لت ہوتی ہے جسمیں انکی دولت و زندگانی خرچ ہوا کرتی ہے کچہری اور مقدمہ بازی جسکی زندگی ہے وہ دُنیا میں سب سے زیادہ خطرناک ہے اور سب سے زیادہ قابل رحم ہے۔

کتاب مقدس تعزیرات ہند اور اس کے تمام دفعات مبارکہ کی قسم کچہری بازوں نے حکام کچہری کو بدنام کر رکھا ہے۔ کچہری کے عشاق اپنے توڑ جوڑ سے قانون کو سیدھا راستہ نہیں چلنے دیتے۔

ضرورت ہے ڈاکٹروں کی جو اِل کچہری کو محکمہ حفظان صحت کے اصول کے ماتحت لاکر کچہری پرستوں کے ٹیکہ لگوائیں اور وبائے کچہری سے انکی تندرستی کو بچائیں۔ نیز شہروں کی میونسپل کمیٹیاں جسطرح اور اور طریقے اختیار کر کے آبادی کی صحت کو امداد دیتی ہیں۔ اسی طرح مختاروں۔ وکیلوں بیرسٹروں کو بھی قواعد صفائی میں شریک کر کے ان کو شہر سے الگ آباد کریں۔ تاکہ یہ جراثیم عام باشندوں کو کچہری کے مرض میں مبتلا نہ کر سکیں جس سے ملک تباہ ہوا جاتا ہے۔

ایک لیڈر درکار ہے

یا

ایک قوم

ہندوستان کے مسلمانوں کو جو گنتی میں چھ کروڑ سے زیادہ اور سات کروڑ کے قریب ہیں ایک لیڈر کی ضرورت ہے۔ دسمبر سے پہلے پہلے درخواستیں آنی چاہئیں کیونکہ مسلم لیگ کے موقع پر اسکی ضرورت ہوگی جسکا جلسہ دسمبر میں قرار پایا ہے۔

مسلمان بہت غریب ہیں نقد تنخواہ نہیں دے سکتے۔ البتہ کئی کروڑ تالیاں۔ ہیئر۔ ہیئر لکڑیوں کی کھٹ کھٹ بوٹوں کی پھٹ پھٹ، سروں کی جنبش۔ ٹوپیوں کی گردش انعام دیجائے گی۔

لیڈر مستقل درکار نہیں ہے جس کو کرسی لیکر واپس دینے میں عذر نہو وہ درخواست کرے، کیونکہ مسلمان دوامی لیڈر کو پسند نہیں کرتے جسطرح انکے خیالات بدلتے رہتے ہیں ایسا ہی لیڈر بدلنے والا چاہتے ہیں۔

جس لیڈر میں یہ اوصاف ہوں وہ بلا تامل عرضی دیسکتا ہے (۱) کانوں سے بہرا ہو (۲) آنکھوں سے اندھا ہو (۳) اسکو نیند بالکل نہ آتی ہو (۴) اسمیں عقل زیادہ نہو (۵) بے اولاد ہو۔

پہلی شرط کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان اسکو گالیاں دیں گے آوازہ کشی کرینگے۔ اتہام لگائیں گے پس اگر اس کے کان ہوئے تو وہ دل برداشتہ ہو جائیگا اور مسلمانوں کو فائدہ پہنچانے کے بجائے انکی زبان بند کرنے کی کوشش کریگا۔

دوسری شرط کا سبب یہ ہے کہ مسلمانوں کے اخبارات اسکی ہجو میں مضامین لکھیں گے اسپر سخت نکتہ چینی ہوگی آنکھیں ہوئیں تو ان عبارتوں کو پڑھکر اسکا دل بجھ جائیگا اور مسلمانوں

کو اس سے نقصان پہنچے گا۔

تیسری شرط کا باعث یہ ہے کہ مسلمانوں کی قومی ضرورتوں کا ایک بڑا ڈھیر اسکے سامنے ہوگا اور وہ جب ہی پوری ہو نگی کہ رات دن مسلسل کام کیا کرے نیند آتی ہوگی تو رات کے بارہ گھنٹے مسلسل فضول جائیں گے۔

چوتھی شرط میں یہ حکمت ہے کہ عاقل لیڈر مشتبہ ہو کر جیل بھیجدیئے جاتے ہیں یا نظر بندی کا شکار ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان کی عقل اور روشنی طبع حد سے بڑھ جاتی ہے اسواسطے بیقل لیڈر چاہیئے تاکہ پبلک تو اسکو بھولا جانتی ہو۔ اور حکومت احمق کاٹ کا اُلّو، اور تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ بھولے اور احمق بنکر آجکل بہت لوگ کام نکال لیتے ہیں مسلمانوں کو بھی کام سے غرض ہے نام سے نہیں۔

پانچویں قید میں یہ راز ہے، کہ اولاد والے لیڈر کو بچوں کے پالنے کا تجربہ ہوتا ہے اور بچے بار دو ہار لاڈ پیار دو متضاد طاقتوں سے پلتے ہیں مسلمانوں کو ایسا لیڈر چاہیئے جو باپ بنکر نہیں بیٹا ہو کر حکومت کرے۔ اولاد والا لیڈر باپ ہونیکا عادی ہوگا۔ تو بیٹے کی خصلت کہاں سے دے گا۔

اے قوم یہ چھیڑ تھی یہ چٹکیاں تھیں دل کے جلے پھپھولے تھے تو لیڈروں کا شکوہ کرتی ہے اپنی نظر انتخاب کو کیوں نہیں پرکھتی تو ایک شخص کی ذراسی خوبی سے اسقدر خوش ہوتی ہے کہ ایکدن میں وہ شخص آسمان پر چڑھ جاتا ہے اور دوسرے دن معمولی بشری خطا سے تو اتنی بگڑتی ہے کہ اسی آسمان نشین کو زمین کی تہ میں پھینکدیتی ہے زندہ قوموں کی یہ خصلت نہیں ہے وہ بہت دیر کے بعد متواتر امتحانوں کے پیچھے رائے قائم کرتی ہیں نہ جلدی معتقد ہوتی ہیں نہ جلدی بدعقیدہ۔

میں مثالیں کیوں دوں۔ ذاتیات کے افسانے سامنے آجائیں گے تو اے اُمت مرحوم خود ہی سمجھتی ہے کہ کتنے تیرے ہاتھ سے ابھرے اور کتنے فنا ہو گئے۔ کہا جاتا ہے تیرا

حسن ترقی کر گیا ہے تو اپنے نیک و بد کو سمجھنے لگی ہے تیری رائے میں قوت اور سرکشوں کو زیر کرنے کی طاقت پیدا ہو گئی ہے۔

کونسل کے انتخابات جلسوں کے چبوتروں اخباروں کے صفحوں پر تو میں بھی اسکا نشان پاتا ہوں اور تجھ کو حر اور جری سمجھنے لگتا ہوں۔

مگر جب ان کسوٹیوں کی حقیقت پر غور کرتا ہوں تو یہ پرکھ غلط ثابت ہوتی ہے کیونکہ یہ کسوٹیاں بھی ناقص اور ادھوری ہیں اور انہی کو مکمل کہنا غلط ہے تو اس کو کھرا کیسے کہیں گے جو ان پر رکھ کر پرکھا گیا ہو۔

میری جان لیڈر منتخب کرنے میں مغرب کی ریس نہ کر بلکہ میں کہوں گا۔ کہ ہر کام میں یورپ کی تقلید چھوڑ دینا تیری اصل رائے کو زندگی بخشے گا تو بناوٹی ملمعوں سے اپنے ارادوں کو سنہری نہ بنا کہ ملمع جلد اُڑ جاتا ہے تیرا مشرقی خیال سنہری رہیگا تو تیرے کام پختہ ہو جائیں گے تو کونسلوں جلسوں اخباروں کے دیکھے بغیر کامی لیڈروں کو پہچان سکے گی۔ دیکھا نہیں سنا نہیں جب کوئی کونسل کا امیدوار ممبری لینے کھڑا ہوتا ہے تو اپنا ایک قصیدہ خود ہی لکھتا ہے جس میں اپنی حمد و ثنا کے ترانے گاتا ہے۔

لکھتے وقت اسکا مشرقی ضمیر اسکو ملامت کرتا ہوگا۔ کہ اپنے منہ سے میاں مٹھو بننا روایات مشرقی کے خلاف ہے لوگ کیا کہیں گے۔ مگر یورپ کی رسم اسے تسلی دیتی ہوگی۔ جہاں یہ قاعدہ معیوب نہیں۔

پہلے پہل تو نے اس کو برا سمجھا تھا اب تو بھی عادی ہوتی جاتی ہے۔ اب تیرے افراد میں خود ستائی کو بے عیب کہنے والے بڑھتے جاتے ہیں۔

کونسلوں میں ان آدمیوں کو بھیج جو چپ ہیں جو کہتے نہیں کرتے ہیں جنہوں نے اپنی ذات کو فائدہ پہنچا کر دکھایا ہے وہی دوسروں کو فائدہ پہنچانے پر قدرت رکھتے ہیں۔ نہ کہ وہ جو دولت اور لفاظی کے زور سے یہ رتبہ حاصل کریں لیڈر مسلمہ لکھنے سے نہیں ہوتے ان کی ہوا

چندوں کی ہوتی ہے۔ ان کی روشنی جلدی گُل ہو جاتی ہے۔

ہم مُسلمان ہیں خود دار اور انجام بین رسولؐ کی اُمت ہیں۔ ہم کو حریت اور قوت آزادی ورثہ میں ملی ہے۔ پس ہم کو لازم ہے کہ جلدی کسی بات پر آمادہ نہوں۔ اس کے سب پہلوؤں کو تنہائی میں سوچیں۔ اس کے ہر نشیب و فراز پر غور کریں۔ مسجدوں کی جماعتوں میں مشوروں سے مدد لیں۔

یہ نہیں کہ ایک اخبار نے لکھا۔ بمبئی بہت چھوٹا شہر ہے تو اس کے پڑھنے والے آمنّا و صدقنا لکھنے لگیں۔ دوسرا اخبار لکھے لاہور لندن سے بڑا ہے تو اسکے ناظرین بیشک بیشک کے نعرہ لگائیں۔

اخباروں کو اپنی زبان بناؤ کہ وہ تمہارے مُنہ سے بولا کریں۔ تم خود ان کی زبان نہ بنو۔ کہ جو ان کے مُنہ سے نکلا تم اسی کو رٹنے لگے۔ لیڈر درکار نہیں ہی آج کل قوم درکار ہے۔ ایسی قوم جو لیڈر بناتی ہو۔ ایسی قوم نہیں جس کو لیڈر روپیہ خرچ کرکے، اخباروں کے حرف حرف کرکے پاؤں کی دوڑ اور دوستونکی مہربانی دے کر خریدتے ہوں اور بناتے ہوں۔

لاکھناؤ نہیں

کروڑناؤ

لکھنؤ کی نسبت سُنا ہے پہلے وہاں نائی آباد تھے اور ان کی ایک لاکھ کی بستی تھی۔ لاکھ نائی سے لاکھ ناؤ ہوا اور لاکھ ناؤ سے لکھنؤ بن گیا۔

دسمبر ۱۹۱۶ء میں یہ لاکھ ناؤ تمام ہندوستان کے حجاموں کا مرکز تھا یعنی ہندوستان کے سب نائی یہاں جمع ہوئے تھے۔ اسواسطے اس وقت

اس کا نام لکھنؤ نہیں بلکہ کرور نئو ہونا چاہیئے تھا۔

نائی اور حجام کے لفظ سے لیگ اور کانگریس کے اراکین بُرا نہ مانیں۔ کیونکہ حجام کمین پیشہ ور نہیں ہے۔ وہ انسان کے چہرہ کی اصلاح کرتا ہے اور لیگ و کانگریس بھی ہندوستانی چہروں کی اصلاح بنانی اپنا مقصود بیان کرتی ہیں۔ اسکے علاوہ "سید القوم خادمہم" پر غور کیا جائے یعنی اس حدیث پر کہ قوم کا سردار درحقیقت قوم کا خادم ہوتا ہے تو معلوم ہوگا کہ اگر وہ حجام بھی مُلک ہند کا ایک حصہ ہے اور کانگریس و لیگ بحیثیت قایم مقامی فرقہ حجام کے لامحالہ نائی ہونے سے انکار نہیں کرسکتی ورنہ اسکی قایم مقامی کی صداقت غلط ہوجائے گی اب کے لکھنؤ میں لیگ و کانگریس کا اتحاد ہوگیا۔ اسکی یادگار منانی چاہیئے۔ اور وہ یہ ہے کہ اب لکھنؤ کا نام کروڑ ناؤ رکھ دیا جائے۔

اُمید ہے کہ اُردو کانفرنس اس کے بارہ میں تاربرقیاں چھپوائے گی۔ جس طرح سینٹ پیٹرزبرگ کے بدلے پیٹروگراڈ کے تار شائع ہوئے تھے۔

مسُ چڑیا کی کہانی!

ایک چڑے چڑیا نے نئی روشنی کی ایک اونچی کوٹھی میں اپنا گھونسلا بنایا تھا اس کوٹھی میں ایک مسلمان رہتے تھے جو ولایت سے بیرسٹری پاس کرکے اور ایک میم کو ساتھ لیکر آئے تھے۔ ان کی بیرسٹری کچھ چلتی نہ تھی۔ مگر گھر کے امیر زمیندار تھے گزارہ خوبی سے ہوا جاتا تھا۔ ولایت سے آنے کے بعد خدا نے ان کو ایک لڑکی بھی عنایت کی تھی جو ماشاء اللہ چلتی پھرتی تھی اور باپ کی طرف سے مسلمان اور ماں کی طرف سے مس بابا تھی۔

چڑے چڑیا نے کھپریل کے اندر ایک سوراخ میں گھر بنایا۔ تنکوں اور

سوت کا فرش بچھایا۔ یہ سوت پڑوس کی ایک بڑھیا کے گھر سے چڑیا لائی تھی۔ وہ بیچاری چرخا کاتا کرتی تھی۔ اُلجھا ہوا سوت پھینک دیتی، تو چڑیا اُٹھا لاتی اور اپنے گھر میں اس کو بچھا دیتی۔

خدا کی قدرت ایک دن انڈا پھسل کر گر پڑا۔ اور ٹوٹ گیا۔ ایک ہی باقی رہا چڑے چڑیا کو اس انڈے کا بڑا صدمہ ہوا جس دن انڈا گرا ہے تو چڑیا گھونسلے میں تھی چڑا باہر دانہ چگنے گیا ہوا تھا۔ وہ گھر میں آیا تو چڑیا کو چُپ چپ اور مغموم دیکھ کر سمجھا میرے دیر میں آنے کے سبب خفا ہو گئی ہے۔

لگا پھدک پھدک کر چوں چوں چیں۔ چرٹ چوں۔ چیں چرٹ چوں۔ چوں، چرٹ چوں چرٹ چوں۔ چوں، اکڑنے کبھی چونچ مار کر گدگدی کرتا۔ کبھی خود اپنے پروں کو پھلاتا۔ ناچتا مٹکتا اور چڑیا کی چونچ پر اپنی چونچ محبت سے رکھتا۔ مگر چڑیا اسی طرح پھولی اُبھری خاموش بیٹھی رہی۔ اس نے مرذات کی خوشامد کا کچھ بھی جواب نہ دیا۔ چڑا سمجھا بہت ہی خفگی ہے۔ مزاج حد سے زیادہ بگڑ گیا ہے۔ خوشامد سے کام نہ چلیگا مجھ مرد کی کتنی بڑی توہین ہے کہ اتنی دیر خوشامد درآمد کی بیگم صاحبہ نے آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھا۔ یہ خیال کر کے چڑا بھی مُنہ پھیر کے بیٹھ گیا اور چڑیا سے بیرُخ ہو کر نیچے بیرسٹر صاحب کو جھانکنے لگا جو اپنی لیڈی کے سامنے آرام کرسی پر لیٹے تھے۔ اور ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ چڑے نے خیال کیا یہ آدمی کیسے خوش نصیب ہیں دونوں کا جوڑا خوش وبشاش زندگی کاٹ رہا ہے ایک میں بدنصیب ہوں۔ سویرے کا گیا گیا دانہ چگ کر اب گھر میں گھسا ہوں۔ مگر چڑیا صاحبہ کا مزاج ٹھکانے میں نہیں ہے کاش میں چڑا نہ ہوتا اور کم سے کم آدمی بنایا جاتا۔

چڑا اسی اُدھیڑ بُن میں تھا کہ چڑیا نے غمناک آواز نکالی۔ چوں چڑے نے جلدی سے مُڑ کر چڑیا کو دیکھا اور کہا چوں چوں چرٹ چوں چوں۔ کیا ہے آج تم ایسی چُپ

کیوں ہو۔ چڑیا بولی انڈا گر کے ٹوٹ گیا۔

انڈے کی خبر سے پہلے تو چڑے کو ذرا سا رنج ہوا۔ مگر اس نے صدمہ کو دبا کر کہا۔ تم کہاں چلی گئیں تھیں۔ انڈا کیونکر گر پڑا۔ چڑیا نے کہا میں اُڑ کر ذرا چمن کی ہوا کھانے چلی گئی تھی جھپٹے کے صدمہ سے انڈا پھسل گیا۔ یہ بیان سُنکر چڑا آپے سے باہر ہو گیا۔ اس کے مردانہ جوش میں طوفان اُٹھ کھڑا ہوا اور اس نے کڑک کر اگرچہ حقیقی ہوئی چوں چوں میں کہا۔ پھوڑ۔ بدسلیقہ۔ بے تمیز تو کیوں اُڑی تھی۔ تجھ کو چمن کی ہوا کے بغیر کیا ہوا جاتا تھا۔ کیا تو بھی اس گوری عورت کی خصلت سیکھتی ہے جو گھر کا کام نوکروں پر چھوڑ کر ہوا خوری کرتی پھرتی ہے۔ تو ایک چڑیا ہے تیرا کوئی حق نہیں ہے کہ بغیر میری مرضی کے باہر نکلے۔ تجھ کو میرے ساتھ اُڑنے اور ہوا خوری کرنیکا حق ہے۔ آجکل تو انڈوں کی نوکر تھی تجھے یہاں سے ہٹنے کا اختیار نہ تھا تو نے میرے ایک انڈے کا نقصان کر کے اتنا بڑا قصور کیا ہے کہ اسکا بدلہ کچھ نہیں ہو سکتا تو نے میرے بچہ کو جان بوجھ کر مار ڈالا۔ تو نے خدا کی امانت کی قدر نہ کی جو اس نے ہمکو نسل بڑھانے کی خاطر دی تھی۔ میں تو پہلے دن منع کرتا تھا کہ اری کمبخت اس کوٹھی میں گھونسلا نہ بنا۔ ایسا نہو۔ ان لوگوں کا اثر ہم پر بھی پڑ جائے۔ ہم بیچارے پرانے زمانہ کے دیسی چڑے ہیں۔ خدا ہم کو نئے زمانہ کے چڑیا چڑے سے بھی بچائے رکھے کیونکہ پھر گھر کے رہتے ہیں نہ گھاٹ کے۔ مگر تو نہ مانی۔ اور کوٹھی میں رہوں گی کوٹھی میں گھر بناؤں گی یہ کہکر میرا ناک میں دم کر دیا۔ اب لا میرا بچہ لا۔ میں تجھ سے لونگا نہیں تو مارے ٹھونگوں کے کچلا بنا دوں گا۔ بڑی صاحب نکلیں تھیں ہوا کھانے اب بتاؤں تجھ کو ہوا کھانیکا مزہ۔ چڑیا پہلے تو اپنے غم میں چپ چاپ چڑے کی باتیں سُنتی رہی لیکن جب چڑا حد سے بڑھا تو اس نے زبان کھولی اور کہا۔

بس بس سن لیا۔ بجز چپکے زبان کو روکو۔ انڈے بچے پالنے کا مجھی پر ٹھیکہ نہیں ہے

تم بھی برابر کے شریک ہو۔ سویرے کے گئے گئے یہ وقت آگیا۔ خبر نہیں اپنی کس سگی کے ساتھ گلچھرے اڑاتے پھرتے ہو بجے دوپہر میں گھر کے اندر گھسے ہیں اور آئے تو مزاج دکھاتے آئے۔ انڈا اگر پڑا مرے پنجہ کی نوک سے ہیں کیا کروں۔ میں کیا انڈوں کی خاطر اپنی جوان جہان جان کو گھن لگالوں دو گھڑی باہر کی ہوا بھی نہ کھاؤں صبح سے یہ وقت آیا ایک دانہ حلق سے نیچے نہیں گیا۔ تم نے بھولے منہ سے یہ نہ پوچھا کہ تو نے کچھ تھوڑا کچھ نگلا یا مزاج ہی دکھانا آتا ہے۔ اب وہ زمانہ نہیں ہے کہ اکیلی چڑیا پہ سب بوجھ تھا اب آزادی اور برابری کا وقت ہے۔ آدھا کام تم کرو آدھا میں کروں۔ دیکھتے نہیں میم صاحبہ کو وہ تو کچھ بھی کام نہیں کرتیں صاحب کو سارا کام کرنا پڑتا ہے اور بچہ کو آیا کھلاتی ہے۔ تمنے ایک آیا رکھی ہوتی میں تمہارے انڈے بچوں کی آیا نہیں ہوں۔

چڑیا کی اس تقریر سے چڑا سُن ہوگیا اور کچھ جواب نہ بن پڑا۔ بیچارہ غصہ کو پیکر پھر خوشامد کرنے لگا اور اسدن سے چڑیا کے ساتھ آدھی خدمت انڈے کی بانٹ کر اس نے اپنے ذمہ لے لی۔

مس چڑیا کی پیدائش

ایک انڈا تو ٹوٹ چکا تھا دوسرے انڈے سے ایک بچہ نکلا جو مادہ یعنی چڑیا تھی۔ جب یہ بچہ ذرا بڑا ہوا اور اس نے میم صاحبہ کے بچّہ کو دیکھا کہ وہ کاٹ کے گھوڑے پر سوار ہوتا ہے۔ گھڑی گھڑی دودھ پیتا ہے۔ ٹب میں بیٹھکر نہاتا ہے نئے نئے خوبصورت کپڑے پہنتا ہے۔ تو اس چڑیا زادی نے بھی باپ سے کہا۔ چیں چیں چیں۔ ابا مجھ کو بھی گھوڑا منگادو۔ ابا میں بھی ٹب میں نہاؤں گی ابا مجھ کو بھی ایسے رنگ برنگ کے کپڑے لاکر دو۔ چڑے نے چڑیا سے کہا

لے سُن۔ دیکھا مزہ کوٹھی میں گھر بنائیگا۔ اب لا اپنی لاڈلی کے واسطے گھوڑا لا ٹپ منگا۔ کپڑے بنا۔

چڑیا نے کہا دیکھو پھر وہی لڑائی کی باتیں نکالیں۔ ایک کی تو تمہاری اس کل کل سے جان گئی۔ یہ نگوڑی بچی ہے۔ تم اس کو بھی نہیں دیکھ سکتے۔ بچہ ہے کہنے دو یہ کیا جانے ہم غریب ہیں اور یہ چیزیں نہیں لا سکتے۔ بڑی ہو گی تو آپ سمجھ لے گی کہ چڑیوں کو آدمیوں کی ریس سے کیا سروکار۔ مس چڑیا نے ماں کی بات سُنکر کہا۔ واہ بی امّاں واہ تم غریب تھیں۔ تم چڑیا تھیں تو اس امیر کی کوٹھی میں آکر کیوں رہی تھیں۔ گاؤں کے چھپر میں گھر بنایا ہوتا۔ میں تو ہرگز نہ مانوں گی۔ اور میم صاحبہ کے بچہ کی سی سب چیزیں منگا کر رہوں گی۔ نہ لاؤ گی تو لو میں گرتی ہوں اور مرتی ہوں۔ یا پَر کاٹے دیتی ہوں۔ نہ زندہ رہوں گی نہ تم پر میرا بوجھ ہو گا۔

چڑے چڑیا نے گھبرا کر کہا۔ ہے ہے۔ ایسا غضب نہ کیجیو۔ اچھا اچھا ہم سب کچھ منگا دیں گے۔ یہ کہکر اور مس چڑیا کو دلاسا دیکر دونوں نے چونچ سے چونچ ملائی اور پھوٹ پھوٹکر رونا شروع کیا۔ روتے تھے اور یہ کہتے تھے ہائے اچھوں کی صحبت اچھا بناتی ہے اور بُروں کی صحبت بُرا کر دیتی ہے۔ یہ بیرسٹر صاحب اچھے سہی مگر انکی صحبت سے ہمارا تو ستیاناس ہو گیا ہائے ہماری لاڈلی ہاتھوں سے نکل گئی۔ ہائے یہاں تو اور کوئی چڑیا بھی نہیں جو ہمارے دُکھ میں شریک ہو۔ چڑے چڑیا روتے تھے۔ اور مس چڑیا قہقہہ لگاتی تھی کہ نئے زمانہ کی اولاد ایسی ہی ہوتی ہے۔

باب سوم (۳)

خالص ادب و انشاء

جمّن جولاہے کا اِرتقاء

ڈارون نامی ایک فلاسفر نے تحقیق کیا ہے کہ آدمی اصل میں بندر تھا۔ ترقی و ارتقاء سے آدمی بن گیا۔ اب ایک ہندوستانی فلاسفر نے دریافت کیا ہے کہ جرمن اصل میں جمّن جولاہا تھا۔ سر پر گھار رکھ کر کپڑا بنا کرتا تھا لیکن ترقی اور ارتقاء کے زور سے اسمیں ایک رے کا اضافہ ہو گیا اور لوگ جرمن کہنے لگے۔ کیا عجب ہی کہ برلن اور بنارس میں بھی کوئی ارتقائی رشتہ ہو۔

پیٹرولیم کا قحط!

خبر آئی ہے کہ جرمن کے ہاں پیٹرولیم کا کال ہے۔ یہ ایک تیل کا نام ہے جو موٹر میں جلتا ہے۔ اس لئے خیال کیا جاتا ہے کہ اب اس کو ہوائی جہاز چلانے میں بہت دقت ہو گی کیونکہ ہوائی جہاز بھی اسی تیل سے اُڑتے ہیں۔

اگر یہ خبر سچی ہے تو ہندوستانی افواہوں کے موجدین کو ایک خاص جلسہ میں اس لفظ پیٹرولیم پر غور کر کے بحث کرنی چاہیئے تاکہ نتیجہ میں کوئی انوکھی خبر دریافت ہو جائے ہو سکتا ہے کہ اس لفظ کے دو جزو ہوں ایک پیٹر۔ دوسرا ولیم۔ پیٹرو گراڈ روس کا

دارالحکومت ہی۔ دوسرا ولیم قیصر جرمنی کا نام ہے سو ممکن ہے کہ روس کا یہ شہر گم ہو گیا ہو یا قیصر ہی جاتا رہا ہو۔ اگر پہلی خبر درست ہے تو پیٹروگراڈ کے نام سے جو تار خبریں آتی ہیں وہ سراسر غلط ہیں کیونکہ وہ پردہ زمین پر آجکل موجود ہی نہیں ہے۔

اور اگر دوسری خبر صحیح مانی جائے تو تسلیم کرنا چاہیئے کہ قیصر ولیم گم ہو گیا یا کم ہو گیا اور جب قیصر میں کمی ہوئی تو لامحالہ جنگ بھی کم یا گم ہو گئی ہو گی لہذا جو خبریں جرمنی کے حملوں کی آتی ہیں وہ سراسر جھوٹ اور بے سروپا ہیں۔

طائر ہوائی کی بیٹ

مشہور ہے کہ کسی شاعر نے ایک شعر کہا اور اسکی داد آسمان سے مانگی، اوپر سے چیل نے بیٹ کی جو شاعر کے مُنہ پر گری۔ اس وقت شاعر نے کہا۔ کہ "سخن فہمی عالم بالا معلوم شد"۔

اسی طرح اُردو کی مثل ہے کہ اسمان کا تھوکا حلق میں آتا ہے۔ جرمن والے جو اپنے آلات حرب کے غرور میں آسمان پر اُڑے چلے تھے اب ان پر انگلستان کے طائر ہوائی (جہاز) بیٹ کر رہے ہیں۔

بیٹ انگریزی میں مارنیکو کہتے ہیں۔ لہذا ہوائی پرندوں کی آتشی بیٹ جرمن کے مُنہ پر ہو رہی ہے۔

جرمن میں مس کی کمی!

کہتے ہیں جرمن میں تانبہ کھٹ گیا ہے۔ اس لئے وہ بلجیم کی رعایا کے برتن لوٹتا پھرتا ہے۔ فارسی زبان میں تانبہ کو مس کہتے ہیں۔ پس اہل جرمن کو چاہیئے کہ وہ اپنی مسوں کی مومیائی بنا کر کیمیائی طریق سے مس بنائیں۔ کیونکہ چشم بددور وہ ہندی میں شہرۂ آفاق ہیں غریبوں کے برتن برباد نہ کریں مسوں کا تانبہ بنانے میں انکا ایک

فائدہ اور بھی ہے کہ نوجوانوں کے جنگ میں مارے جانے سے لاکھوں کنواریاں حسرت کی آہیں کھینچ کھینچ کر گرشتہ ہو رہی ہوں گی اسکا تدارک قیصر پر فرض ہے۔ پس اس سے بہتر اور کیا تدارک ہو سکتا ہے۔ مرد تو کام آتے ہی تھے عورتیں بھی ٹھکانے لگجائیں گی اور پروشیا کی خونخوار کالونی کا جن میں سے جنگی بھوت برآمد ہوتے ہیں۔ یوں خاتمہ ہو جائے گا۔

ہم ہتھیار کیا کریں گے

کانگریس کے پردہان نے اپنے ججمان انگریزوں سے درخواست کی ہے کہ اب ہندوستانیوں کو ہتھیار ملجانے چاہئیں۔ تاکہ وقت بے وقت ملک کے دشمن کا مقابلہ کر سکیں۔

مگر ہم کہتے ہیں کہ ہتھیاروں کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔ ہندوستانیوں کے پاس گالیوں۔ کوسنوں کی کیا کمی ہے۔ جو یہ ہتھیاری چیزیں ہاتھ میں لیں۔ یہ وقت تو ایک عام جلسہ منعقد کرنیکا تھا۔ جسمیں ایک خاص ریزولیوشن آف تھینکس پاس کیا جاتا۔ کہ سرکار نے بددعاؤں گالیوں پر اپنی مہربانی سے لائسنس نہیں لگایا۔

ہم کالوں کی تو وہ کالی زبان ہے کہ اگر جی لگاکر۔ دانت پکچکا کر کوسنے دیں تو جرمنی کے بڑے مُنہ کی توپوں میں کیڑے پڑ جائیں۔

ہتھیار ہاتھ میں آئیں گے تو ملکش مسلمان گالیاں بھولکر خواہ مخواہ جھوٹ ہتھیا اترآئیں گے۔

مسجد میں بتخانے کا ذکر

علی گڑھ کی اچھوتی علمی کانفرنس کے جلسہ میں صدر انجمن نے اس ان کہنی چیز کا نام بھی لے دیا۔ جس کو پھٹے دیدے والے جنگ کہتے ہیں اور کہا بھی تو اسطرح کہ اہل مغرب کو لامذہب بنا دیا۔ مسجد والے مولوی رحیم بخش صاحب کی اس سچی جرائت پر جتنی اذانیں دیں تھوڑی ہیں، مگر انصاف یہ ہے کہ آئندہ کے لیئے اس مثال سے طرح طرح کے اندیشے ہوتے ہیں۔ علی گڑھ کانفرنس میں سیاست کا ذکر اذکار کیا کہیں بس ہے شان پروردگار۔

پپیا

اس لفظ میں دو پے ہیں۔ اس واسطے انگریزی زبان کے لفظ پاپولر (ہردلعزیز) کے زیر اثر آ گیا ہے۔ آج کل ریوٹر کی تارخبروں میں بہت مستعمل ہے اور ہر اخبار اپنے کالموں میں اس کے لیئے جگہ نکالنے پر مجبور ہے۔

ایک چیونٹی کا بیان قرآن شریف میں ہے کہ بادشاہ لوگ چھوٹوں کو بڑا اور بڑوں کو چھوٹا کر دیتے ہیں۔ پس کتب لغات کے تمام الفاظ اس لفظ کی آسمان نشینی پر جسقدر رشک کریں کم ہے کہ یہ عزت اسکو لڑائی کے سبب حاصل ہوئی ہے۔

جنرل فان

فان ہنڈن برگ جرمنی کا مشہور سپہ سالار۔ اس کو کسی نے مشورہ دیا کہ فلاں فلاں دریا کے کنارے کنارے جاؤ۔ تو پیٹروگراڈ فتح ہو جائے گا۔

جنرل نے ایک تقریر میں کہا۔ کہ اگر روسی اقرار کرلیں کہ وہ میرے اس سفر میں مزاحمت نہ کریں گے تو میں اس مشورہ پر عمل کرسکتا ہوں۔

پھر اس نے کہا میں خود ہی ان تجاویز پر عمل کرلوں گا۔ کیونکہ میں فنون جنگ سے ناواقف نہیں ہوں۔

بیشک جنرل فان کو اپنی خودی کے بل پر کام کرنا ہوگا۔ مگر انکی خودی جس اسم کا سبے ہے۔ اس میں فان لگا ہوا ہے جسکے معنی فنا ہونے کے ہیں۔

معلوم نہیں وہ اس لفظ سے فاعلیت کا اثر حاصل کریں گے یا مفعولیت کا آخری اثر ہوا تو انکے ہاتھوں سے جرمنی قوم کا فنا ہوجانا لازمی ہے۔

رومانیہ کی رے

رومانیہ بھی اپنی حفاظت اور ملکی دوراندیشی کی خاطر شریک جنگ ہونے والا ہے کون جانتا ہے کہ اس رو کی پشت کیا ہوگی۔

رن کی رے بڑی ہولناک ہے۔ جرمنی کے رے سے پوچھو، فرانس کی رے سے دریافت کرو۔ روس کی رے مُنھ سے بول رہی ہے۔ آسٹریا کی رے فریاد کر رہی ہے۔ برٹش کی رے میدان میں جمی کھڑی ہے۔ ترکی کی رے ہم بھی ہیں پانچویں سواروں میں کہکر جنگ میں کود چکی ہے اس چھٹی رے سے کون کہے کہ اپنے مان کو رہنے دے لڑائی بُری چیز ہے۔

مگر یہ رے نہ مانی تو ارتقائی اثر سے ڈر ہے کہ امریکہ کی ساتویں رے میدان میں بے حجاب نہ ہوجائے۔

آپان

جاپانی وہاں کے چاول کھانے والے ہندوستان کے پان کے قریب ہونیکے سبب اپنے ملک کو جاپان کہتے ہیں۔ان سے کہدو کہ ہمارے پان کو نظر نہ لگائیں کیونکہ ان کی زبان سے جاپان سُنکر جی دہڑکتا ہے۔ وہ ہمارے دوست ہیں تو اپنے ملک کا نام آپان رکھ لیں تاکہ پان خور ہندوستانی وہاں جاکر علم و ہُنر سیکھ آیا کریں پان پر جا کا لفظ ٹھیک نہیں۔

عرب والے جاپان کو یابان کہتے ہیں شاید انھوں کے اسی ہندوستانی دور اندیشی کو ملحوظ رکھا ہو۔

مصر کی مصری

بیمار آدمی کو مٹھاس بہت مضر ہے پھر خبر نہیں ترکی کو کس خطرۂ جاں طبیب نے رائے دی کہ وہ مصری کھانے گھر سے نکلے۔

کمزور معدہ کو مصری اچھی نہیں۔ ایسا نہو سنار کا جلاب دینا پڑے۔ کاش کوئی ہمدرد مرد بیمار کو اس حرکت سے روک سکتا۔

آسٹریا کی آس

آسٹریا کے بڑے بادشاہ نے جس آس پر لڑائی چھیڑی تھی اس کا بڑا خمیازہ بھگت چکا ہے اب اسکی آس ترکی جنگ سے بندہی ہوئی ہے۔ افرط (بعد) کی خبر خدا جانے مگر اس وقت تو اس کی آس پوری ہوتی نظر نہیں آتی۔

عبّاس کی باس

عباس حلمی سابق خدیو مصر حملہ اور فوج کے کمانڈر بنے ہیں۔ باس کے معنی عربی میں جنگ کے ہیں اگر انکو اس جزو نے لڑائی پر آمادہ کیا تھا تو حلمی نے نہ روکا۔ اور بردباری وبرداشت کی صلاح نہ دی دیکھئے اس عبدالباس (غلام جنگ) کے معانی کیسے رہتے ہیں۔

خطیب کے ساتھ کنگ جارج

اخبار خطیب کے ہر پرچے کے ساتھ حضور بادشاہ سلامت رہتے ہیں اور ان کی ہمراہی ہو۔ تو کوئی انگریزی ڈاکخانہ اس کو قبول نہ کرے۔
یوں تو ہر اخبار کے ساتھ جہاں پناہ کی شبیہ سایہ افگن ہے۔ مگر خطیب کے سوا آجتک کسی نے اس کی معیت کو قدردانی کی نگاہ سے محسوس نہیں کیا (بتاؤ اس معمہ کو)

جنوری میں جانوری

جنوری کی سردی میں ہر انسان جانور بن جاتا ہے اور ہر وقت لحاف و کمبل کے بھٹ میں گھسا رہنا چاہتا ہے لہذا اس ماہ کی رخصت کے وقت یہ اپیل انجمن ترقی اردو کے گوش گزار کرنا بر محل ہوگا کہ وہ اسکی جانوری پر کسی لائق شخص سے کوئی کتاب لکھوائے۔

بڑے آدمی کی بات

دکن کے سفر میں ایک بڑے آدمی نے مجھ سے کہا کہ میں اپنے لڑکے کو علی گڑھ کالج

بھیجنا چاہتا ہوں۔ مگر آجکل دہلی میں جرمن سے لڑائی ہو رہی ہے سواسطے ارادہ ملتوی کر دیا۔ چونکہ بڑے آدمی کی بات بڑی سمجھی جاتی ہے میں نے بھی اس کو بڑا سمجھا اور کوئی وجہ نہیں کہ اسپر یقین نکروں لہذا مانتا ہوں کہ ضرور دہلی پر جرمن لڑ رہے ہیں۔ اور جبکہ وہ میرے شہر پر لڑ رہے ہیں تو مجھ پر انکا مقابلہ فرض ہے لہذا میں تمام بڑے آدمیوں کی بڑی باتونکا ایک لشکر جمع کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ جرمنی کی بڑی توپ جیت سکوں۔ مجھے اُمید ہے کہ دہلی والوں کی بڑی باتوں کے گولے جرمنی گولوں پر ضرور فتح پائیں گے۔ کیونکہ جرمنی توپ موٹر پر چل سکتی ہے۔ مگر یہاں کی بڑی باتیں اسقدر وزنی ہیں کہ کسی چیز سے نہیں اُٹھ سکتیں بس بھاری چیز ہلکی چیز پر قدرتاً فتح پاتی ہے۔

کوہِ قاف کی پریاں

پرانے زمانہ میں مشہور تھا کہ کوہ قاف میں دیو پری کی آبادی ہے۔ اب خبریں آئی ہیں کہ وہاں ترکوں نے حملہ کیا ہے۔ اور انور بے اس فوج کے گلفام بنکر گئے ہیں۔ دیکھئے قاف کی سبز پری کو روس کا لال دیو آدم زاد کے پہلو میں دیکھ سکے گا یا نہیں۔ آسمان کے راجہ اندر بھی گوارا نہیں کریں گے کہ آدم زاد پریزادوں میں رہے اور ترکوں کو مایوسی کے ساتھ واپس آنا پڑے گا۔ مگر ہمیں کیا ہم تو ہندوستان کے پرستان میں رات دن سارنگیوں کے آس پاس کی پریاں نچاتے ہیں۔ یہ ڈراونے کام انہی خوبیوں کو مبارک جنکا دیدہ پھٹا ہوا ہے۔

تاب ریز

تبریز تاب ریز کا مخفف ہے جب ایران کے عاشقوں نے بیتابی کی شکایت کی تو یہ شہر

تاب و توانائی تقسیم کرنے کھڑا ہوگیا۔ اب یہ خود مدت سے بیتاب تھا۔ سنتے ہیں ترک و لر بایانہ انداز سے اس کے گھر میں آیا اور اسکی پشت پر ہاتھ رکھ کر مسکرایا خبر نہیں تاب ریز کے دل پر اس کی آمد سے کیا گزری ہوگی۔ تاب آئی ہوگی یا بیتابی بڑھ گئی ہوگی مگر ہمارا جی تو اس ترکی پرزش سے بیتاب ہوگیا۔ کیونکہ یہ اپنے ساتھ رقیب جرمن کو بھی لایا ہے۔ کسی اور مستانہ کو لاتا تو مزہ آتا۔ قوال گاتا۔ مولوی ہرگز نہ شد مولانا روم، تا غلام شمس تبریزی نہ گشت، تو ہم بھی حال لاتے، اب شمس تبریز کی ادائیں نہیں، برق ریلنی کی شعاعیں ہیں ان سے ہمیں کیا واسطہ وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی ؎

کیا بحث ہے ایرانی ہے یا ترک و عرب ہے — اس وقت تجھے قطع نظر چاہیئے سب سے
گر تخت پہ بیٹھے کوئی یا تخت سے اترے (اکبر) — رکھ کام تو دن رات فقط طاعت رب سے

دردمہ

اخبار ہمدرد کو الٹ کر دیکھو تو دردمہ بن جائے۔ اس واسطے ثابت ہوا کہ ضرور اس کے ایڈیٹر کے شکم میں ہلال کا درد ہے۔

پس کوئی وجہ نہیں کہ مسٹر محمد علی کو تندرست مانا جائے اور ڈاکٹر انصاری کو انکے آپریشن کی صلاح ندی جائے کیونکہ ڈاکٹر موصوف ترکی مشن کے تجربوں کے سبب تمام ہلالیہ امراض سے واقف ہوں گے۔

لال ہلا

الہلال بند ہوگیا، یہ بے نقط اخبار تھا۔ اور سب کو بے نقط سناتا تھا جب

چارۂ کار کی تدبیریں ہونے لگیں تو اس کے حروف کو بھی الٹ کر دیکھا۔ تو حکم ملا دلال ہلا معلوم نہیں الہلال کے محرر خصوصی لالوں کا بلانا منظور کریں گے یا نہیں۔ طوطے تو بہت سے پال چکے ہیں۔ لالونکا پنجرا بھی رکھ لیں تو کیا مضائقہ ہے۔

راؤ اور وار

اگر راؤ بہادر لوگ واریں بہادری کے جوہر دکھائیں تو آئندہ ان کو وار بہادر کا خطاب ملنا چاہیئے اور لازم ہے کہ وہ لڑائی میں ضرور جائیں کیونکہ وار انکے نام میں مخفی ہے۔

اخبار ریش پنجاب

لاہور میں سکھوں کا شیر پنجاب نامی اخبار نکلتا ہے، اور سکھ ڈاڑھی کی حفاظت میں شہرۂ آفاق ہیں۔ اسواسطے یہ اخبار درحقیقت ریش پنجاب ہے۔

اس کے علاوہ شیر کا لفظ اندنوں کچھ مناسب بھی نہیں۔ ریش میں یہ فائدہ ہے۔ کہ بازی کے وقت بابا کی ریش ہے۔ اگر بازی ہونے لگے تو بازی گروں کو سب یہ کہکر دھمکا دیں گے، کہ جا! بازی بازی باریش بابا ہم بازی؟

بطیخ اخبار

بطیخ عربی میں تربوز کو کہتے ہیں۔ پس اخبار خطیب اصل میں تربوز اخبار ہے۔ جو دیکھنے میں خون آشام مگر باطن میں شیریں اور جی کو ٹھنڈا کرنیوالا ہے۔

گلاب پریس

درویش پریس ایک قسم کا گلاب پریس ہے۔ کیونکہ یش کا عکس ہی لو درو کا اُلٹا وُرُ د جسکے معنی گلاب کے ہیں۔ گویا ایک قسم کا گلاب۔

خونی تجارت کے نمونے

یورپ نیچر پرست ہے اور اس لئے نیچر بھی اس کی ناز برداریوں کا خیال رکھتی ہے اس نے دیکھا کہ میرے پرستار کا تجارتی لین دین ہندوستان سے بھی تھا اور تجارتی مال کے نمونے یہاں آیا کرتے تھے، اس واسطے اس نے یورپ کے خونی کاروبار کے نمونے یہاں بھی بھیجنے شروع کئے ہیں۔

پہلا نمونہ خوراک کی تنگی ہے جو ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پھیل چکی ہے۔ دوسرا بمباری ہے جو پنجاب میں شروع ہوئی ہے۔ تیسرا نمونہ بارش اور ٹھنڈی ہوا ہے۔ یا تو مینہ برستا ہی نہ تھا اور برسا تو ایسا کہ غریب ہندوستانی ٹھٹر کے رہ گئے گویا نیچر دکھائی ہے کہ میدان جنگ میں اس قسم کی سردی ہوگی۔ ہم کو یہ نمونے دیکھ کر نیچر سے کہدینا چاہیئے کہ بالفعل اسمیں سے کوئی نمونہ پسند نہیں لہذا فرمائش نہیں دیجا سکتی۔

بمب

خواجہ میر درد نے فرمایا تھا۔ درد جس پہلو سے اُلٹو درد ہے اب درو دنیا نکا وقت نہیں ہے قسمت نے بمب کا درد دکھایا ہے۔ یہ بھی اس مصرعہ کا شریک معلوم ہوتا ہے

ور کہہ سکتے ہیں کہ بمب جس پہلو سے اُلٹو بمب ہے"۔

زوجۃ الاؤنس

خان بابا مسٹر محمد علی نے اعتراض کیا ہے کہ مسٹر ٹول پرنسپل علی گڑھ کالج کی تنخواہ میں سو روپیہ کا اضافہ کیوں کیا گیا۔ کالج کے ٹرسٹیوں کا کہنا کہ یہ مسٹر ٹول کی بیوی اور بچی کا الاؤنس ہے چونکہ اس قحط سالی کے زمانہ میں مسٹر ٹول بیوی کا خرچ برداشت نہیں کر سکتے تھے اس لئے ٹرسٹیوں نے زوجہ الاؤنس منظور کر لیا۔ مگر ٹرسٹیوں کا بیان ہے کہ اضافہ عارضی ہے۔ دربارِ دشمناں یہ بڑا بدشگونی کا مقام ہے۔ ہم تو دعا کرتے ہیں کہ مسٹر ٹول اپنی اہلیہ کے ساتھ ہمیشہ شاد و آباد رہیں۔

دیکھنا یہ ہے کہ مسٹر محمد علی ہندوستانیوں کے لئے بھی قحط الاؤنس سرکار سے طلب کرتے ہیں یا نہیں۔ اگر کالے نوکروں کے لیئے مانگتے ہو۔ تو گورے نوکرونکو پہلے دینا بھی چاہیئے۔

التحیات کی اُنگلی

مصر سے خبر آئی ہے کہ وہاں جمعہ کے خطبوں سے خلیفہ اسلام کا نام نکالدیا گیا ہے۔ صرف خلیفہ کا لفظ لکھا ہے۔ اسپر اخبار ہمدرد کو تعجب ہے کہ لفظی خلیفہ سے کون شخص سمجھا جائیگا۔ ہو واسطے اس نے صلاح دی ہے کہ ہمدرد میں ایک اشتہار دیا جائے کہ ضرورت ہے خلیفہ کی"۔ درخواستیں خوشخط آنی چاہئیں۔ امیدواروں کو تھوڑی سی عربی جاننی لازمی ہے ہماری رائے میں یہ ہونا چاہیئے کہ جسطرح التحیات میں تشہد کے وقت اُنگلی کا اشارہ کیا جاتا ہے اسی طرح خطیب خلیفہ کا نام لیتے وقت اُنگلی کو گردش دیدیا کرے۔ ترکی کے دوست

اس اشارہ کو سلطان کی جانب سمجھ لیں گے اور باقی لوگ اپنے اپنے مفہوم پر منطبق کر لیں گے۔

اس سے بھی زیادہ مناسب یہ تجویز ہے کہ خلیفہ محمد حسین صاحب وزیر پٹیالہ کے خاندان سے اسمیں مشورہ کیا جائے، کیونکہ انکے ہاں خلیفہ نام کے ساتھ شریک ہے۔

خفیف عدالت کا جج

میں نے ان کی میز پر کاغذوں کا انبار دیکھا تو خیال ہوا کہ کوئی بڑے سیاح ہیں سفر نامہ کے اوراق دیکھ رہے ہیں۔ یا فطرت و سائنس کے محقق ہیں۔ علمی کارناموں کا ذخیرہ سامنے ہے مگر سوال کرنے پر انہوں نے نہایت خفیف ہو کر کہا فدوی خفیف عدالت کا جج ہے۔ ساری زندگی دس پانچ روپے کے جھگڑوں میں گذری چلی جاتی ہے۔ جب لوگ کہتے ہیں جج صاحب تشریف لائے ہیں تو دل میں اندر ہی اندر خفیف ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ آپ نے جو ان کاغذات پر سفر نامہ یا تحقیقات فطرت و سائنس کا شبہ کیا اس سے مجھے بڑی غیرت آئی۔ کاش میں ایک سیاح اور غلا سفر ہوتا اور خفیف عدالت کا جج نہ ہوتا۔

سارنگی اور پیانو

سارنگی بج چکی اب پیانو کا دور تھا وہ بھی چپ ہوتا چلا ہے۔ کسی نے سارنگی سے پوچھا تم مدت سے ہماری بزم میں نہیں آئیں۔ اس نے کہا آؤں کیا خاک جن سے بزم میں زینت ہے وہ آگے کھڑی ہوتی ہیں اور میں سازندہ کے پاس پیٹھ پیچھے بلبلایا کرتی ہوں۔

پیانو کی قسمت دیکھو خود مس صاحب اپنی انگلیوں سے نوازتی ہیں۔ اگر بی گوہر خود سارنگی بجائیں تو میری ہستی سلامت رہ سکتی ہے۔ ورنہ ایک دن ہند میں پیانو کے سوا میری شکل کہیں بھی نظر نہ آئے گی۔

گوہر ولایت ہو کر آئی ہیں۔ انہوں نے وہاں سیکھا ہوگا۔ کہ اپنے ملک کی ہر چیز کو دوسروں پر فوقیت دیجاتی ہے۔ خبر نہیں گوہر جان نے سارنگی اور پیانو کی نسبت کیا فیصلہ کیا۔ کہ ان میں سے کون بہتر ہے۔ اگر وہ ہندوستان کی سپوت لڑکی ہیں (کیونکہ مجھے گوہر جان کے باپ کا نام معلوم نہیں) تو ان کو لازم ہے کہ سارنگی خود بجایا کریں۔ ورنہ یورپ والے کہیں گے کہ ہندوستانی اپنا کام دوسروں کے سپرد کر دیتے ہیں۔ اسی لئے تو ذلیل رہتے ہیں۔

موتی محل فنا میں

ان کو بہشت کے قصر گوہر کا یقین نہ تھا۔ اس لئے انہوں نے گوہر جان کے وجود کو موتی محل تصور کیا۔ اور اس کے ناچ میں اپنی موتی کی سی آبرو برباد کی وہ کہتے تھے۔ گوہر بھی بحرین کا ایک پرانا موتی ہے۔ موتیوں کا والہ اسی قسم کے گوہر پرستوں کا نکلا تھا۔ مگر ان لوگوں کی آنکھوں میں شیطان موتیا بند ہو کر بیٹھ گیا ہے مریں گے تو قدر معلوم ہوگی اور کھلے گی۔

پیش آورد

آمد اور آورد کے فرق کو شاعر خوب جانتے ہیں۔ آمد کو آورد پر بڑی فوقیت ہے

لیکن سُنا ہے کہ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ شاعؔ آورد کرتا ہے اور ہوتے ہوتے آمد ہونے لگتی ہے۔

شہر پشاور کی اصل بھی پیش آور ہے۔ اور کسی زمانہ میں ہندوستان کے ہر فاتح کو پہلے یہی شہر پیش آتا تھا۔ گویا پشاور آمد اجنبی کا دروازہ آور وتھا۔

خیر ہم شاعر نہ فاتح۔ آورد اور آمد دونوں سے سروکار نہیں پیش آورد ہو یا پیش آمد ہمیں کیا ہمیں تو اپنی پیش آنی (پیشانی) کے لکھے پر زندگی گزارنی ہے۔

جارجانہ حملے

جن لوگوں کو عربی کے موٹے موٹے الفاظ کی سمجھ نہیں ہے وہ آجکل اخبار ونمیں جارحانہ حملوں کو جارجانہ حملے پڑھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ جس حملہ میں خود سبقت کی جائے وہ ہمارے جارج بادشاہ سے منسوب ہے اور یہ جارجانہ لفظ شاہ جارج سے ہی تعلق رکھنے والا بول ہے۔

ناروے

اس لفظ کے دو حصے ہیں۔ پہلا نار عربی یعنی آگ' دوسرا وے انگریزی یعنی راستہ گویا ناروے باب النار ہے' ابتک تو وہ لڑائی کی آگ سے الگ تھا۔ مگر عجب نہیں کہ اپنے نام کی نحوست کے سبب اسکو بھی جہنم رسید ہونا پڑے۔

روٹی کا فوٹو!

قحط سالی کے زمانے میں اگر روٹیوں کے فوٹو غربا میں تقسیم ہو جائیں تو یقین ہے کہ انکو بھو

بازار لوٹنے اور غل وشور کرنے کی ضرورت نہ رہے گی کیونکہ ہندوستان صورت پرست ہے۔ روٹی کو دیکھکر پیٹ بھر لیگا۔ کل ہوٹل کے مینجر صاحب نے بھی یہی کہا تھا کہ خود تو کیک کھایا اور مجھ کو اسکا فوٹو دیا میں خوشی خوشی اسکو اپنے گھر لایا اور بازار سے ایک پیسہ کی ریوڑیاں منگائیں اور کیک کے فوٹو کو دیکھتا جاتا تھا اور ریوڑیاں کھاتا جاتا تھا۔

پس اگر روٹیوں اور مٹن چاپ کے فوٹو تقسیم ہو جائیں تو غریب لوگ چنے چبائیں گے اور مزے مُرغی کے انڈے اور مٹن چاپ کے لیں گے۔

خوپوشی سے رُوپوشی

خبر آئی ہے کہ لاہور کے انگریزی پڑھنے والے طالب علم کہیں روپوش ہو کر غائب ہو گئے انگریزی تعلیم کی نسبت پرانے لوگوں کا عقیدہ تھا کہ وہ ایمان پوش ہے اور خوپوش ہے یعنی انگریزی پڑھ کر انسان کا ایمان اور عادت بدل جاتی ہے اب اس خبر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ روپوشی بھی سکھاتی ہے۔

کوئی ان جوانمردوں سے پوچھے کہ عورتوں کو پردہ سے نکالتے نکالتے خود پردہ نشین کیوں ہو گئے۔ مرد تو مردِ میداں بنکر کام کرتے ہیں۔

دہلی میں میکائیل

بنگال کے لاٹ صاحب جنکا نام نامی میکائیل ہے دہلی تشریف لائے ہیں۔ ہم لوگوں کا عقیدہ ہے کہ میکائیل بارش کا فرشتہ ہے۔ یہ فرشتہ آجائے تو عزرائیل کا کہاں ٹھکانا ہوگا جو قحط کے سبب آجکل ہر گھر میں مسلط ہے۔ مگر مشکل تو یہ ہے جہاں ایک مہمان پہلے سے موجود ہو دوسرے کی خاطر و تواضع

ہوتی ہے۔ اس موقعہ پر حاجی اسمٰعیل خان اسمعیل، کو آگرہ سے بُلا کر مشورہ کرنا چاہئے۔

طواف اور طوائف

مسلمانوں کو فکر ہے کہ حرمین مقدسہ حریفوں کی دستبرد سے محفوظ رہیں کیونکہ کعبہ کے طواف کی چاہت پر انکے خون کی گردش منحصر ہے۔
ہندوستان کے رنگیلے جوان کہتے ہیں، طواف رہے یا نہ رہے طوائف کو سلامت رہنا چاہیئے کہ ہر آرزوئے زلیست کا مرکز ہے۔

لیلےٰ کی ضبطی

دہلی میں ایک مفسدانہ اشتہار انا لیلیٰ کے عنوان سے شائع ہوا تھا جس کو سرکار نے ضبط کر لیا۔ لکھنے والے کو یہ خیال نہ آیا کہ اس قسم کا اشتہار ضبطی سے محفوظ نہ رہیگا۔ پھر اسکا نام لیلیٰ کیوں رکھا۔ غریب لیلیٰ بھی ضبط ہوگئی تو مجنوں کا کہاں ٹھکانا رہیگا۔
کل کسی نے مجنوں سے پوچھا کہ اس جنگ میں فتح کس کی ہوگی۔ اس نے کہا جدھر لیلیٰ ہوگی اُدھر ہی فتح ہوگی۔ اب کون اسے خبر دے گا۔ کہ تمہاری انا لیلیٰ کار ہونے والی لیلےٰ تو خود اسیر و ضبط ہوگئیں۔

گورنمنٹ رسیدہ

خدا رسیدہ لوگوں کا زمانہ تو گیا، گورنمنٹ رسیدہ اصحاب میں مسٹر گوکھلے بھی خوب آدمی تھے۔ موت نے ان کو کفن کے لفافہ میں بند کرکے شمشان بھومی میں بھیجدیا اور یہ پتہ

درج تھا۔

اللھم بلغہ بالخیر۔ لف ہذا خاص بمقام موضع عدم پور۔ ڈاکخانہ نابود آباد۔ ضلع نیستی۔ تحصیل فنا گنج رسیدہ بعالی خدمت کارکنان علیین وسجیین ادام اللہ مقامہم برسد اگر مکتوب لیہ بمقام علیین باشد آنجا رسد واگر بمقام سجیین باشد آنجا رسد۔ عرا معلوم نیست کہ من ملک الموت باشندہ ملک ہندوستانی ہستم۔

چکی کا گیت

چکی کے پاٹوں میں گیہوں پس رہے تھے۔ آٹا بن رہے تھے۔ مگر چکی کا گانا سننے سے باز نہ آتے تھے۔ چکی گانا گاتی تھی۔ کہ میں بھوکی رہتی ہوں۔ مگر دوسرے کے پیٹ کی خاطر قتل عام کرتی ہوں۔ گیہوں حال میں آکر جواب دیتے تھے۔ لال سے سفید بنتے ہیں۔ یہ قتل ہے یا مہربانی۔ آجکل تو ہر کالا اور گندمی آدمی گورا بننا چاہتا ہے۔ ہم بھی تیری عنایت سے سفید مُنہ ہو جائیں گے تو ساری عمر احسان مانیں گے۔

مارچ کا مُورچہ

مارچ کی تلوار کو مورچہ نے کھالیا۔ اب یہ مہینہ دنیا سے مارچ (کوچ) کر کے جانیوالا ہے۔ اس ماہ کے شروع ہوتے ہی جنگ کے مورچے ہر جگہ بڑھنے لگے۔ اور لشکروں نے ایک دوسرے پر مارچ کرنا شروع کر دیا۔ اب یہ دن خدا کے ہاں جاتے ہیں جس کسی کو کچھ پیام بھیجنا ہو۔ یا کوئی خط دینا ہو۔ اس کو دیدے۔ خدا کے حضور میں یہ پیش کر دے گا۔ ہم نے بھی اس کے ذریعہ یہ پیام بھیجا ہے۔

بخدمت حضرت وقت ایل۔ ٹائم سکرٹری حضور پروردگار عالم۔

سر، مہربانی فرماکر حضور عالم پناہ جل شانہٗ کی یادگار میں عرض کیجئے کہ سورج اب تک مشرق سے نکل رہا ہے۔ ہدایت فرمائی جائے کہ حسب وعدہ اب وہ مغرب سے طلوع ہو۔

راقم۔ یور تربت قلی حسن نظامی۔

اَپ ریل

دو دن کے بعد ماہ اپریل کا دور شروع ہو گا یعنی وقت کی ریل ڈاؤن سے اَپ ہو گی یا یوں کہئے کہ نیچے سے اوپر جائیگی۔ ریل جب کبھی کسی پہاڑ پر چڑھتی ہے تو مسافروں کو بڑے سناٹے آتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ خدا کرے۔ اب جب زمانہ اور وقت کی ریل ڈاؤن سے اَپ ہوتی ہے تو ہم جیسے کمزوروں کا کلیجہ بانسوں اُچھلتا ہے۔ سنتے ہیں پہاڑوں کے باشندے اَپ ڈاؤن ہونے میں بڑے ماہر ہیں۔ یعنی پہاڑوں پر بے تکان چڑھتے اُترتے ہیں۔ لہٰذا انکو وقت کی ریل میں بٹھا دیا جائے اور ہم کو اس سفر سے معافی ملے تو اچھا ہے۔ ہمارا جی تو اس ریل پیل سے گھبرا گیا ہے

مہمبندی

سمپل نمبر ۲ نمونہ ثانی۔ قوم کوہستانی کا ہے۔ مہم ان میں بند ہے اور یہ مہم میں بند عرف عام میں مہمندی مشہور ہیں مگر بندش ماہ سے بے شعور ہیں۔

آفریدی

حیوان ہیں۔ ناطق ہیں متحرک ہیں۔ جامد ہیں۔ کھجور ہیں قد و قامت میں کیکر میں خار وں سے لبریز ہیں۔ ترش آم ہیں سخت اخروٹ ہیں۔ لوہے کے انجن ہیں۔ بجلی کے تار ہیں

پلیگ کا بجا رہیں۔ دغا دغا ان کی بولی میں۔ داغ داغ ان کی جھولی میں۔

وزیری

نہ بادشاہ کو مانیں نہ وزیر کو۔ مگر وزیری کہلاتے ہیں۔ ہمیشہ امن کے طوطے اُڑاتے ہیں۔ شمع زر کے پروانے ہیں۔ بزم حرب کے مستانے ہیں۔

دردانی آل

دانیال ایک پیغمبر کا نام تھا۔ توریت میں انکے خوابوں کی دہوم ہے۔ دردانیال قسطنطنیہ کی ڈیوڑھی ہے مگر پرائے گڑکی ریوڑی ہے۔ سمندروں کی رال اسکے دامنوں میں بہتی ہے۔ آجکل یہاں ترکوں اور اتحادیوں کا لام ہے اور روس کے دانے گزرنے پر یہ طول کلام ہے قسطنطنیہ کے دربان اس ڈیوڑھی پر لڑ رہے ہیں۔ دیکھئے کیا انجام ہو۔

قانون کا نون

قرآن شریف کی سورتوں میں سورہ نون میں خدا نے قلم اور اس کے نوشتوں کی قسم کھائی ہے اور برطانی سرکار نے جدید قانون تحفظ ہند کے قاف نے قلم اور ہر ایک چیز پر جو قیامت خیز ہل چل کے معنی ہو۔ نگہداشت کی مُہر لگائی ہے۔ نون قاف کی لڑائی ہے مگر کمبختی میرے ناخن کی آئی ہے جو محبت کی سرشاری میں پہلوئے یار کو ہر وقت چٹکی سے گدگدایا کرتا ہے۔

بیس ہزار باتیں

سرکار نے ظفر علی خان کی ضمانت کے لیئے بیس ہزار روپیہ مانگا ہے۔ مگر یہاں

روپیہ کہاں تارک دنیا قوم کے پاس اور یہ وسواس مثل ہے کہ چیل کا گھونسلا اور ماس۔ ہاں نئے سکے کی بیس ہزار باتیں یہاں موجود ہیں۔ ایک کہتا ہے کہ ظفر علی اسی قابل تھا۔ بڑا شریر ہے۔ بڑا مفتری ہے۔ دوسرا کہتا ہے جان قربان باپ قربان۔ تیسرا کہتا ہے۔ زرمی طلبی سخن درین ست۔

جھینگر کا جنازہ

میری سب کتابوں کو چاٹ گیا۔ بڑا موذی تھا۔ خدا نے پردہ ڈھک لیا۔ اُفوہ جب اس کی لمبی لمبی دو مونچھوں کا خیال کرتا ہوں جو وہ مجھ کو دکھا کر ہلایا کرتا تھا تو آج اُسکی لاش دیکھکر بہت خوشی ہوتی ہے۔ بھلا دیکھو تو قیصر ولیم کی برابری کرتا تھا۔

اس جھینگر کی داستان ہرگز نہ کہتا۔ اگر دل سے عہد نہ کیا ہوتا کہ دُنیا میں جتنے حقیر و ذلیل مشہور ہیں۔ میں ان کو چار چاند لگا کر چمکاؤں گا۔

ایک دن اس مرحوم کو میں نے دیکھا کہ حضرت ابن عربی کی فتوحات مکیہ کی ایک جلد میں چھپا ہوا بیٹھا ہے۔ میں نے کہا کیوں رے شریر تو یہاں کیوں آیا۔ اچھلکر بولا ذرا اسکا مطالعہ کرتا تھا۔ سبحان اللہ۔ بھائی کیا خاک مطالعہ کرتے تھے۔ بھائی یہ تو ہم انسانوں کا حصہ ہے۔ بولا وہ قرآن نے گدھے کی مثال دی ہے کہ لوگ کتابیں پڑھ لیتے ہیں مگر نہ انکو سمجھتے ہیں نہ ان پر عمل کرتے ہیں۔ لہذا وہ بوجھ اُٹھانیوالے گدھے ہیں۔ جن پر علم و فضل کی کتابوں کا بوجھ لدا ہوا ہے۔

مگر میں نے اس مثال کی تقلید نہیں کی۔ خدا مثال دینی جانتا ہے تو بندہ بھی اسکی دی ہوئی بلاغت سے ایک نئی مثال پیدا کر سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان مثل ایک جھینگر کے ہے جو کتابیں چاٹ لیتے ہیں۔ سمجھے بوجھتے خاک نہیں۔

یہ جتنی یونیورسٹیاں ہیں سب میں یہی ہوتا ہے۔ ایک شخص بھی ایسا نہیں ملتا جسنے علم کو علم سمجھ کر پڑھا ہو۔

جھینگر کی یہ بات سنکر مجھ کو غصّہ آیا اور میں نے زور سے کتاب پر ہاتھ مارا، جھینگر پھدک کر دوسری کتاب پر جا بیٹھا اور قہقہہ مار کر کہنے لگا۔ واہ خفا ہو گئے بگڑ گئے لاجواب ہو کر لوگ ایسا ہی کیا کرتے ہیں۔

لیاقت تو یہ تھی کہ کچھ جواب دیتے۔ لگے ناراض ہونے اور دھتکارنے۔

ہائے کل تو یہ تماشا دیکھا تھا۔ آج غسل خانہ میں وضو کرنے گیا تو دیکھا۔ بیچارے جھینگر کی لاش کالی چیونٹیوں کے ہاتھوں پر رکھی ہے۔ اور وہ اس کو دیوار پر کھینچے لئے چلی جاتی تھیں۔

جمعہ کا وقت قریب تھا خطبہ کی اذان پکار رہی تھی۔ دل نے کہا جمعے تو ہزاروں آئیں گے۔ خدا سلامتی دے۔ نماز پھر پڑھ لینا۔ اس جھینگر کے جنازہ کو کندھا دینا ضروری ہے۔ یہ موقعے بار بار نہیں آتے۔

بیچارہ غریب تھا۔ خلوت نشین تھا۔ خلقت میں حقیر و ذلیل تھا۔ مکروہ تھا۔ غلیظ سمجھا جاتا تھا۔ اسی کا ساتھ نہ دیا تو کیا امریکہ کے کروڑپتی راک فیلر کے شریک ماتم ہوگے۔

اگرچہ اس جھینگر نے ستایا تھا۔ جی دُکھایا تھا لیکن حدیث میں آیا ہے کہ مرنیکے بعد لوگوں کا اچھے الفاظ میں ذکر کیا کرو۔ اس واسطے میں کہتا ہوں :

خدا بخشے بہت سی خوبیوں کا جانور تھا۔ ہمیشہ دُنیا کے جھگڑوں سے الگ کونے میں کسی سوراخ میں بوریئے کے نیچے آبخورے کے اندر چھپا بیٹھا رہتا تھا۔

نہ بچھو کا سا زہریلا ڈنک تھا۔ نہ سانپ کا سا ڈسنے والا پھن۔ نہ کوّے کی سی شریر چونچ تھی نہ بلبل کی مانند پھول کی عشق بازی۔ شام کے وقت عبادت رب کیلئے ایک مسلسل بین بجاتا تھا۔ اور کہتا تھا کہ یہ غافلوں کے لئے صور ہے اور عاقلوں کیلئے جلوہ طور۔

ہائے آج غریب مر گیا۔ جی سے گذر گیا۔ اب کون جھینگر کہلائیگا۔ اب ایسا مونچھ والا کہاں دیکھنے میں آئیگا۔ ولیم میدان جنگ میں ہے ورنہ اسی کو دو گھڑی پاس بٹھا کر جی بہلاتے کہ مری مٹی کی نشانی ایک یہی بے چارہ دنیا میں باقی رہ گیا ہے۔ ہاں تو جھینگر کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے۔ چیونٹیاں تو اسکو اپنے پیٹ کی قبر میں دفن کر دیں گی۔ میرا خیال تھا کہ ان شکم پرستوں سے اس توکل شعار فاقہ مست کو بچاتا۔ اور ویسٹ منسٹر ایبے یا قادیان کے بہشتی مقبرہ میں دفن کراتا۔ مگر جناب یہ کالی چیونٹیاں بھی افریقہ کے مردم خور سیاہ وحشیوں سے کم نہیں۔ کالی جو چیز بھی ہو۔ ایک بلائے بے درماں ہے۔ اس سے چھٹکارا کہاں ہے۔

خیر تو مرثیئے دو لفظ کہکر مرحوم سے رخصت ہونا چاہیئے۔ ؎

جھینگر کا جنازہ ہی ذرا دھوم سے نکلے قیصر کا پیارا ہے اسے توپ پہ کھینچو۔

اے پروفیسر اے فلاسفر۔ اے متوکل درویش۔ اے نغمۂ ربانی گانے والے قوال ہم تیرے غم میں نڈھال ہیں اور توپ کی گاڑی پر تیری لاش اٹھائینگے اور اپنے بازو پر کالا نشان باندھنے کا ریزولیوشن پاس کرتے ہیں۔ خیر ابتو تو شکم مور کی قبر میں دفن ہو جا۔ مگر ہم ہمیشہ ریزولیوشنوں تجھے یاد رکھیں گے۔

بنت چھپکلی

خدا کے لئے ریز لو جلدی آؤ۔ اس بنت چھپکلی کو دیوار پر سے ہٹاؤ۔ ایکساں پروانوں کو کھائے چلی جاتی ہے۔

گرمی آئی میں نے لیمپ جلایا۔ پروانوں کی آمد ہوئی لکھنا پڑھنا خاک نہیں ان کی بیقراریاں دیکھ دیکھکر جی بہلاتا ہوں۔ یہ شریر چھپکلی زادی کہاں سے آگئی جو غریب

عشق بازوں کو نگل رہی ہے۔

ابھی تو مس ہے لیڈی ہو گی تو خبر نہیں کیا غضب ڈھائے گی۔ اسکی دُم کاٹ لو۔ بڑی حرافہ ہے۔ کیوں ری حرد ار میرے چہیتے پتنگوں کو کیوں کھاتی ہے جلادوں تیرا مُنہ بھڑکاؤں شعلہ بجھاؤں تیری زندگی۔

ہائے ریز لو۔ تم ابتک نہ آئے دیکھو اس نے پھر ایک تیتری کو پکڑ لیا مُنہ میں دبائے بیٹھی ہے۔ گردن اونچی کرتی ہے اور نگلنا چاہتی ہے۔ بیچاری تیتری کیسی بیکسی سے اسکے مُنہ میں گرفتار ہے۔

بھائی یہ عشق بُری بلا ہے نہ روشنی بر آتی نہ جان گنواتی شعلہ پر چمپنی تھی محبوب کے رُخ تک اسے رسائی نہ ملی تو چھپکلی نے آتش شکم کی نذر ہوئی۔

اللہ ایک زمانہ تھا جب ابادیہ کا شانہ تھا۔ ہر چیز صاف تھی نہ مچھر آتے تھے کھٹمل پسوؤں سے بھی نجات تھی چھپکلیوں کا بھی گزر نہ ہو سکتا تھا۔ مگر جب سے ویرانہ میں گھر بنا ہے سب ستانے آتے ہیں طرح طرح سے چٹکیاں لیکر رُلاتے ہیں تم کہتے ہو ہم اسکے پرچے کو چٹکیاں لکھ کر دوں۔ کیا لکھوں میرے دل میں خود گُو چٹکیاں لیرہے ہیں اور تم خیال نہیں کرتے۔

خبر نہیں خدا نے مجھ کو یہ حس کیوں دی ہے۔ اس کے ہاتھوں جی نڈھال ہے ہر صبح و شام جان کو نیا وبال ہے۔ مجھ کو سوخت ہوتی ہے آپ کباب کا مزہ اُٹھاتے ہیں۔ اچھی تعریف ہے اچھی واہ واہ ہے۔

فطرت شناسی کیسی مجھے خدا کے یہ جانور چین نہیں لینے دیتے کہاں جاؤں اور کیونکر دل سے ان باتوں کو جُدا کروں۔ جب طبیعت میں موج آئے گی لکھدوں گا ابھی تو اس خط کو چٹکیوں میں درج کردینا۔

کم ان

مائی ڈیر ۱۶ سولہ

ویل کم، ہلو ہلو۔ مائی ڈیر ۱۶ سنہ۔ اندر آئیے کیک چکھیئے۔ کم مٹھاس کی چار پیجئے۔ انگیٹھی گرم ہے ہاتھ سینکئے۔ ناک کو تو سردی نہیں لگتی خنکی معلوم ہو تو اس کو بھی گرما لیجئے، مگر ہاں آپکے ناک ہے بھی یا نہیں، ۱۵ سنہ کے تو نہ تھی۔ اہل جرمنی نے وعدہ خلافیاں۔ عہد شکنیاں کر کے بیچارے کی ناک کاٹ لی تھی۔

بھائی میرے گھر میں بریک فاسٹ کا تو کوئی سامان نہیں ہے۔ تیرہ تیزی کی گھونگنیاں کھا کر دن کاٹتا ہوں۔ تمہارے لیئے ایک خانساماں سے کیک کا ایک ٹکڑا اور ٹھنڈی پھیکی چار کی ایک پیالی مانگ لایا تھا۔ "چہ کند بے نوا ہمیں دارد" صبر کر کے اسی کو نوش کر لو۔ زیادہ حرص ہو تو میدان جنگ میں جاؤ وہاں سب کچھ ملے گا۔

ذرا سننا خدا نے کہا تھا میں خود زمانہ اور وقت ہوں۔ کیا تم بھی خدا ہو۔ کیونکہ تم بھی ٹائم اور وقت ہو مگر خدا تو بدلا نہیں کرتا اور تم بارہ مہینہ میں بدل جاتے ہو۔ لہذا معلوم ہوا کہ تم خدا نہیں ہو۔ پس جب تم خدا نہیں ہو تو لاؤ میرا کیک پھیر دو اور چار کی پیالی بھی واپس دو۔

ہاں یاد آیا میں تو مشرقی ہوں اور مشرق والے دیکر واپس نہیں لیا کرتے۔ اچھا خیر کھا لو۔ نگل لو۔ تھور۔ تو تمہیں کس نے بلایا تھا۔ مان نہ مان میں تیرا مہمان۔ آؤ بھگت کرتا تو اپنے محرم کی کرتا جو میرا لاڈلا ہے۔ ہجری سنہ کا پہلا پیغام لیکر آتا ہے تم سے مجھے کیا غرض۔ تمکو پادری صاحب کے یہاں جانا چاہیئے تھا۔

لاحول ولاقوۃ۔ معاف کیجئیگا۔ جناب بھوک و مفلسی میں انسان کی عقل قابو میں نہیں رہتی۔ آپ ہمارے بادشاہ کی نشانی ہیں۔ ہر دفتر میں آپ ہی کا سکہ چلتا ہے۔ ہماری قوم تو آپ سے اسقدر محبت رکھتی ہے کہ ہر شخص دیوار پر آنکھوں کے سامنے آپ ہی کو لٹکاتا ہے

جنوری کی قسم میں تمہارا تابعدار ہوں و فاشعار خادم ہوں۔ تمہارا کیا کہنا۔ بڑے اچھے ہو کیسے گرم گرم کوٹ لاتے ہو۔ تمہارے آنیکی خبر سُنکر ایک مہینہ پہلے خیرات بانٹنے والے مجھکو لحاف بنوا دیتے ہیں اور لحاف کے اندر مجھکو ایسا آرام ملتا ہے جیسے کچھوا اپنے خول میں۔

میری عادت خوشامد کرنیکی نہیں ہے پر آج تو میں تمہاری خوشامد کرونگا۔ اور کہو تو تمہارے بوٹ بھی صاف کرنے میں عذر نہو گا۔ لیکن یہ وعدہ کر لو کہ تم ۱۹۱۵ء اور ۱۹۱۶ء کی خونریزی کو بند کرا دو گے۔

میاں مجھے اس لڑائی سے تو کچھ تکلیف نہیں۔ دُنیا میں کچھ بھی ہوا کرے مجھے اس سے کیا غرض۔ البتہ یہ بے آرامی ہے کہ سوئیاں اور رنگ بہت مہنگا ہو گیا ہے جانتے ہو کہ میں دمڑی دھیلہ کا آدمی ہوں۔ سوئیاں سستی بکتیں تو اپنی گُدڑی میں آسانی سے پیوند لگا لیتا تھا اور اُدھی کا رنگ لاکر اس کو رنگ لیتا تھا۔ اب یہ دونوں اسقدر گراں ہیں کہ میں نہ سوئیاں خرید سکتا ہوں نہ رنگ یونہی میلا کچیلا چیتھڑے لگائے پھرتا ہوں۔

اگر تم لڑائی بند نہ کراؤ تو یہ دونوں چیزیں تو سستی کرا دو۔ بس میں تو فقط اتنا چاہتا ہوں۔ مجھے نہ خطاب چاہیئے نہ کونسل کی ممبری۔ میں تو روکھی روٹی پیٹ بھر کر۔ اور کنویں کا پانی اور تن کا موٹا جھوٹا کپڑا، چاہتا ہوں۔

کنویں کا پانی اسواسطے درکار ہے کہ نل کا پانی لوہے کے مُنہ سے آتا ہے اور لوہا آج کل توپ میں، بندوق میں، گولے میں، گولیوں میں، آدمی کا خون بہاتا ہے اور میں خون خرابے میں بہت ڈرتا ہوں، اندیشہ ہے کہ لوہے کا پانی پیکر کہیں مجھ میں فتنہ و فساد کا اثر نہ آجائے۔

وہ پلک ہے یا نیمچہ
یا
نین کٹاری

یہ چیخ کیوں ماری، کیا زخم تھا کاری۔ دل کو دیکھو۔ جگر کو ٹٹولو۔ کہیں نہ کہیں چرکہ ضرور ہوگا۔ یہ چھری لہو چاٹنے والی ہے اسکا وار کب خالی گیا ہے۔
یہ خیال نہ کرنا کہ گوشت کی بنی ہوئی آنکھ پر پلک ایک ننھا سا بال ہے۔ بابا یہ فتنی سینہ کے زخموں کے لیے بڑا ہی وبال ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں اسکی ٹیڑھی نوک گرد و غبار کی ڈھال ہے۔ آنکھ کے نازک فرش کو خاک دھول سے بچاتی ہے ذرا ادھر آ کر آئے تو۔ اپنی نکیلی ڈھال پر روک لیتی ہے۔
شاعر اس کو نیزہ کہتے ہیں۔ نیمچہ کا لقب دیتے ہیں اور جن آنکھوں کی یہ پاسبان ہے۔ انکو تیغ اور کٹاری کہہ کر پکارتے ہیں۔ بھوؤں کو کمان سے مشابہت دیتے ہیں۔ جس کے تیر نظر پر بیان کیجاتی ہیں۔
میں نہ ڈاکٹر نہ شاعر ایک معمولی دہقان ہوں۔ کھیت بوتا ہوں اور اس کے آس پاس کیکر اور بیری کے کانٹوں کی باڑ لگاتا ہوں۔ پس میرے خیال میں وہ پلک نہ نیمچہ ہے نہ نیزہ اور آنکھ نہ تیغ ہے نہ کٹاری بلکہ کسومبہ کی کیاری ہے جس کے آس پاس کانٹوں کی باڑ ہے۔ تاکہ بیدرد جانور ان مجھو رسر خرو پھولوں کو پامال نہ کر سکیں۔
میں اپنے کھیت میں آنسوؤں کا پانی دیتا ہوں تو پھولونکا منہ دھلا کر ان پلکوں کو کبھی جھنپیا دید یا کرتا ہوں۔ یہ بڑی ملنسار ہیں تر ہو کر آپسمیں ملجایا کرتی ہیں۔

سنتا ہوں سُرخ رنگ مہنگا ہوگیا ہے اور ڈرتا ہوں کہ کوئی پٹواری میرے کسومبی کھیت کا پتہ رنگ فروشوں کو نہ بتادے۔ اور وہ پلکوں کی باڑھ کے اندر گھس کر لال لال ڈوروں کے پھول نہ توڑ لیں یا سرکار سے کہکر ان پر محصول نہ لگوادیں اسواسطے کہتا ہوں کہ جو مادی رنگ کے لالچ سے اندر آئیگا ہاتھ خالی جائیگا۔ میرے کھیت کے پھول دل کے باطنی کپڑوں کو رنگ سکتے ہیں جس کو اس کی طلب ہو وہ آئے۔ دو آنسو جگر کی آہ میں رکھکر نذر کرے۔ میں پلکوں کی باڑھ ہٹادوں گا اور اپنے گل لالہ کے رنگ سے اسے لالہ فام بنادوں گا۔

افواہوں کے لطیفے

قیصرہ کے بچے کو سنے میں آتے ہیں

خدا کی مار اس کھو جڑے پیٹی لڑائی کو۔ ننے کے ابا کو جنر نہیں ہو کیا گیا ہے کسی نے کچھ کھلادیا ہے یا کچھ کردیا ہے یا دشمنوں کے دماغ میں کچھ خلل آگیا ہے۔ لڑائی کے پیچھے ایسے ہاتھ دھو کے پڑے ہیں کہ کسی ارمان ادہر سے خیال نہیں ہٹتا لاکھوں عورتیں بیوہ ہوگئیں۔ بیشمار بچے یتیم ہوگئے۔ گھر بار جڑوں سے کھُد گئے لیکن ننے کے ابا کے سر سے لڑائی کا جن نہ اُترا۔ لوج ایسے مردوے بھی کس کام کے سمجھاتے سمجھاتے سر چکرا گیا مگر انکے کان پر جوں تک نہ چلی۔

خدا رکھے میرے جوان جمال لالوں کو خواہ مخواہ ساری دُنیا کے کوسنے میں آتے ہیں۔ بھاڑ میں جائے یہ بادشاہی چولھے میں جائے یہ تخت و بخت۔ مجھے ڈوروکھی سوکھی روٹیاں بس ہیں۔ میں کل کل کی بادشاہی ایک دم کو بھی نہیں چاہتی۔ میرے بچے جئیں جیا سو برس۔ بس یہی میری بادشاہی ہے۔

قیصرہ دل ہی دل میں یہ باتیں کررہی تھی کہ سامنے سے ولی عہد آتا دکھائی دیا۔

اور دور سے۔ بولا اماں اماں بھوک مان روٹی۔
قیصرہ نے ولیعہد کی چٹ چٹ بلائیں لیں۔ اور کہا چلو بیٹا دستر خوان بچھا ہوا ہے
ذرا تمہارے باواجان کو بُلا لوں سب ملکر کھانا کھانا۔
ولیعہد نے ٹھنک کر کہا۔ نہیں بی ہمیں تو ابھی کھلا دو۔ ابا جی خبر نہیں کبتک
آئیں گے وہ تو لڑائی کے کاغذ پڑھ رہے ہیں۔
ولیعہد کی بات پوری نہوئی تھی کہ قیصرہ کی چھوٹی لڑکی بسورتی ہوئی آئی اور
ماں کے لہنگے کو پکڑ کر کہا۔ اری بی آج روٹی دو گی یا بھوکا مارو گی۔
قیصرہ بچّوں کو لیکر دالان میں گئی۔ کھانے پر بٹھایا اور لپکی ہوئی قیصر کے پاس
پہنچی۔ قیصر اسوقت اُپلوں کی دھونی رمائے ایک کھوپڑی سامنے رکھے کچھ منتر پڑھ رہا تھا
کالے ماش آگ میں ڈالتا جاتا تھا اور سیندور کے ٹیکے کھوپری میں لگا رہا تھا۔
قیصرہ یہ یہ تماشہ دیکھ کر پہلے تو بہت ڈری مگر پھر ذرا جی کڑا کر کے بولی۔
اے تم کیا کر رہے ہو، چلتے نہیں۔ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ قیصر نے ایک
ہوں کی اور ہاتھ کے اشارہ سے کہا تم چلو بچّوں کو کھلاؤ میں ابھی آتا ہوں۔
قیصرہ بولی بس ہوں ہاں ہو چکی۔ لونا چماری کو بُلا چکے دو نوالے چلکر کھاؤ بچوں کو
کھلاؤ جو بھوک کے مارے بلبلائے جاتے ہیں۔
قیصر نے یہ سُنکر تیوری چڑھائی اور زور سے دھتکار نیکی ایک ہوں کی
بیچاری قیصرہ کانپ گئی اور آنکھوں میں آنسو بھرے وہاں سے اُلٹی پھری۔ راستہ
میں اس نے کہا ارے میری تو قسمت پھوٹ گئی۔ خدا کی سنوار اس موئے
پادری پر جس نے اس دیوانے مجذوب سے میرا نکاح پڑھا یا۔ میں کیا جانتی تھی کہ میری
تقدیر پر ایسے پتھر پڑ جائیں گے۔
یہ کہتی ہوئی دستر خوان پر آئی اور روٹی کا ٹکڑا توڑ کر کھانے لگی۔

اتنے میں قیصر بھی آیا اور چپ چاپ کھانا کھانے لگا۔ قیصرہ سے بات کی نہ چوں سے۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد قیصرہ بولی۔

اے دیکھنا میں تم سے ایک بات کہوں۔ اگر خفا نہ ہو۔ میرا تو تمہارے مزاج سے ناک میں دم آگیا ہے۔ بات کہتے کلیجہ لرزتا ہے۔

قیصر نے گردن موڑ کر کہا کہو کیا بکتی ہو۔ مُنہ سے پھوٹ چکو۔ جو بکنا ہے بکو۔

قیصرہ سہم گئی اور کہا اسی واسطے تو میں تمہارے مُنہ نہیں لگتی۔ بات کہنا ظلم ہے اُلٹے پھاڑ کھانے کو۔

قیصر نے نرمی سے کہا۔ کہو گی بھی آخر کیا بات ہے۔

قیصرہ نے کہا یہی اس موذن لڑائی کے واسطے کہتی تھی میرا تو دم ناک میں آجاتا ہے۔ دیکھئے اس بھونچال کا انجام کیا ہوتا ہے اور تقدیر کیا کیا چکر دکھاتی ہے۔ تمہیں تو لڑائی بھڑائی میں مزہ آتا ہے اور میرے بچے مفت میں کوسنے کھاتے ہیں۔

قیصرہ نے ابھی کچھ جواب نہ دیا تھا کہ ولی عہد بولا کہ ہاں ابا اماں جی سچ کہتی ہیں۔ آپ ناحق دُنیا میں خون خرابا کرتے ہیں۔ ساری دُنیا سے آپ کیونکر جیت سکینگے خدا دیکھا نہیں عقل سے پہچانا ہے۔

قیصر یہ سُنکر مسکرایا اور اپنی جیب میں سے ایک بکس نکالا اور اس کو کھولا۔ جس کے اندر ایک جزدان تھا اس کو کھولا تو ایک اور جزدان نکلا۔ اس کو کھولا تو تیسرا نکلا غرض اسی طرح سے سات جزدانوں کے اندر سے ایک آئینہ برآمد ہوا۔ قیصر نے اس آئینہ کو دہوپ کے رُخ چمکایا تو یکایک سامنے ایک باغ پیدا ہو گیا۔ قیصرہ اور ولیعہد اس باغ کو دیکھ کر حیران رہ گئی اسکے بعد قیصر نے اس آئینہ کو پھر چمکایا۔ تو وہ باغ جلکر خاک ہو گیا۔

قیصر یہ تماشا دکھا کر بولا۔ دیکھا میرے منتروں کو جب یہ آئینہ میرے پاس ہے تو

میں کوسنے کاٹنے کی کیا پرواکروں میرا کسی کے کوسنے سے بال بیکا نہ ہوگا۔
قیصرہ اور ولیعہد ششدر بُت بنے کھڑے تھے اور کہتے تھے کہ بیشک اس جادو کا
جواب دُنیا میں کہیں نہیں۔

یہ آئینہ کی افواہ دلی میں بہت مشہور ہوئی تھی اور اس کے اوپر کچھ اور حواشی بھی
تھے جنکا لکھنا عبث تھا۔ لہذا صرف آئینہ کی افواہ پر میں نے دلی کی مستورات کے ولولہ کا رنگ
چڑھا دیا اور سمجھ لیا کہ وہ قیصر جرمن کی قیصرہ نہیں دلی کے کوئی زرکوب یا زردوز کا خاندان ہوگا
جنکی حالت پر یہ خیال تصنیف کیا گیا۔ اور سُننے والوں کو اس نے مزہ دیا۔

عشق باز ٹڈہ

ہزاروں لاکھوں ننھی سی جان کے کیڑوں پتنگوں میں ٹڈہ ایک بڑے جسم اور بڑی جان کا
عشق باز ہے اور پروانے آتے ہیں تو روشنی کے گرد طواف کرتے ہیں بیقرار ہو ہو کر
چمنی سے سر ٹکراتے ہیں۔ ٹڈے کی شان نرالی ہے۔ یہ گھورتا ہے۔ مونچھوں کو بل
دیتا ہے اور اُچک کر ایک حملہ کرتا ہے۔ سمجھتا ہوگا میں ٹکر مار کر روشنی کو فتح
کر لونگا۔ سب کم ذات چھوٹے رقیبوں کی آنکھ میں خاک ڈالکر اپنی محبوبہ کو اُڑا
لیجاؤنگا۔ اور آگے کے درخت پر بیٹھ کر اس کو گلے لگاؤنگا۔ میرے گیت سُنکر روشنی
ہمیشہ ہمیشہ کو میری تابعدار بن جائے گی۔

پر ہائے عشق کے کوچہ میں کسکا خیال پورا ہوا ہے۔ کس کی آرزو بر آئی ہے
کون بامُراد رہا ہے جو ٹڈہ کا ارمان پورا ہوتا۔ حسرت نصیب اُچک اُچک۔ پھدک پھدک کر
گھور گھور کر رہجاتا ہے اور نور پر قبضہ میسر نہیں آتا۔

مجھ کو ان عاشق زار کیڑوں نے بہت ستایا ہے میرے رات کے مطالعہ میں
یہ شریر بڑا رخنہ ڈالتے ہیں۔ سر کے بالوں میں آنکھوں میں۔ کانوں میں گھسے چلے آتے ہیں۔ کوئی

پوچھے کہ بھئی آدمی کے سر کیوں ہوتے ہو جب جی آیا ہے اُسکے پاس جاؤ۔ اس سے ملنے کی کوشش کرو۔

مگر وہ تو زمانہ کی تاثیر ہے۔ آج کل ہر عشق باز باتون اور لسان ہو گیا ہے۔ جان دینے اور معشوق پر قربان ہو جانے کی ہمت جانوروں تک میں نہیں۔ اب وہ وقت گیا شیخ سعدی نے بلبل کو پروانہ کی سرفروشی کا طعنہ دیا تھا اور کہا تھا کہ عشق پروانہ سے سیکھ کہ بولتا نہیں ایکدفعہ آکر جان دیدیتا ہے۔

ابتو پروانے بھی آتے ہیں تو آدمیوں کو ستاتے ہیں۔ ان کے ناک کان میں گھستے ہیں۔ تاکہ وہ انکی عشق بازی سے آگاہ ہو جائیں۔ نمود کا شوق آدمیوں سے گزر کر جانوروں تک میں سرائت کر گیا۔ ان دنوں ہر ہستی دکھاوے اور ریاکاری کی مشتاق ہے۔ یہ کیڑے صرف اپنے عشق کا اظہار کرنے کو آدمی پر گرے پڑتے ہیں تاکہ اس کو علم ہو جائے کہ ان کو روشنی سے محبت ہے۔ ذرا انصاف کرنا۔ کل میں نے مسہری کے پردے ڈالکر سرہانے روشنی رکھی کہ ابتو ان نمسو بازوں سے چھٹکارا ملیگا۔ مگر موذی ننھے کیڑے مسہری کے چھوٹے سوراخوں میں گھس آئے اور ایسی سورش کی کہ میں نے کتاب اُٹھا کر دے ماری۔ غصہ سے بتیا بجھ گیا دیوانوں کی طرح کیڑوں کو، برسات کو اور اس موسم کی رات کو برا بھلا کہا۔

اور تو اور غسل خانہ الگ کونہ میں ہے اسکے دروازہ پر تو چلمن پڑی ہوئی ہے وہاں بھی ان فتنوں کی فوج گھستی چلی جاتی ہے کیونکہ غسلخانہ میں بھی انکی فاحشہ معشوقہ روشنی رکھی ہے۔

ٹپ کا سمندر

آج صبح جو میں نہانے کے لیئے اندر گیا تو کیا دیکھتا ہوں۔ کہ ایک سبز رنگ کا ٹڈہ ٹپ میں تیر رہا ہے۔ کہتا ہوگا میں سمندر میں غوطے کھا کھا کر اے جان تیری یاد کرتا ہوں۔ غارت کرے خدا تجھ کو اور تیری جان جاناں کو۔ میرے پانی کو گھناؤنا کر دیا۔

دیکھو تو لمبے لمبے پاؤں پھیلائے ڈبکیاں کھاتا ہے دم توڑتا ہے مگر روشنی کی اُلفت کا
دامن نہیں چھوڑتا۔
اس فطرت کو خدا کی سنوار اس کے ہاتھ میں کیا آتا ہے۔ برسات میں اس کثرت سے
کیڑے کیوں پیدا کرتی ہے اور ان کو عشق میں کیوں مبتلا کرتی ہے اسکو کسی بشر کا بھی خیال
ہے یا نہیں جو اشرف المخلوقات ہے، جو رات کے چپ چاپ وقت کو اور فرصت و اطمینان
کی گھڑیوں کو ان کمبخت کیڑوں کی بدولت مفت رائیگاں کرتا ہے۔
اب صبح ہو گئی تب بھی چین نہیں۔ اور نہیں تو نہانے کے پانی میں اپنے جسم کا جہاز
دوڑا رہے ہیں، یہ ساری کارستانیاں نیچر (فطرت) کی ہیں۔
آج سے مجھے کوئی مصوّر فطرت نہ کہنا۔ میں ایک آزار دہندہ فطرت کی تصویر کشی
سے ہاتھ اُٹھاتا ہوں۔ میرا اس نے ناک میں دم کر دیا ہے۔
ٹم ضاٹپ کے سمندر میں جان دے رہے ہیں۔ آرزو یہ ہے کہ مجنوں اور فرہاد کے
رجسٹر میں انکا نام بھی لکھا جائے۔ ڈوب کر مرنے کا صلہ انکو بھی ملے۔ ہرگز نہیں میں تجھ کو مرنے
ہی نہ دوں گا۔ زندہ نکالکر پھینکدوں گا۔ دیکھوں کیونکر تیرا نام دفتر عشق میں لکھا جائیگا۔
خیال تو کرو حضرت کی صورت کیا سہانی ہے۔ چکٹی سا چہرہ۔ بال سی گردن۔ لمبا
ناؤ سا بدن۔ اسپر ٹانگیں شیطان کی آنت۔ جانور ہے یا ہوا ہے۔
فطرت صاحب کی عقل کے قربان جایئے کیا بدشکل پرندہ بنایا ہے میں فطرت ہوتا اور
عشق باز جانوروں کو پیدا کرتا تو بدن کے ہر حصّہ کو سراپا درد و سوز بناتا جس کے دیکھتے ہی
دیکھتے ہوئے دل آہ آہ کرنے لگتے، جناب فطرت نے شکل بنائی ایسی اور درد دیا عشق کا
کیا وضع الشئ علی غیر محل کا کام کیا ہے۔
اُفوہ۔ بس اب نہیں بنتا۔ سقہ آئے تو تازہ پانی بھرواؤں، جب نہاؤں گا۔ اور
اس عشقباز ٹڈے کی فریاد اور دواد سب کردوں گا۔

جگر زخم کے ٹکڑے

کاغذ کی گرانی - ہندوستان میں جتنے کارخانے کاغذ بنانیکے ہیں وہ راتدن بچاری کلوں کو چلاتے ہیں - پل بھر کا آرام انہیں نہیں لینے دیتے - گھاس اور گودڑ ڈھونڈتے پھرتے ہیں جن سے کاغذ بنایا جاتا ہے - اسپر بھی پوری نہیں پڑتی - کاغذ کا بھاؤ دن بدن گھڑی بگھڑی منٹ بہ منٹ سکنڈ بہ سکنڈ بڑھتا چلا جاتا ہے - غریب اخبار والے رسالے والے اور سب کاغذ چھاپ کر قومی، ملکی، اور شکمی خدمت کرنیوالے حواس باختہ ہیں - بٹوے سے روپے نوٹ نکال نکال کر دے رہے ہیں اور کاغذی بس نہیں کرتے کہتے ہیں اور لاؤ - کوئی ہے لالہ جی صاحب میاں جی کے دل پر ہاتھ رکھ کر تو دیکھو - وہ کمبخت دھڑک رہا ہے اور کاغذ کی گرانی سے سہما جاتا ہے - کاغذ کا بھاؤ یہی رہا یعنی اسکی تیزی بڑھتی رہی تو اخباروں اور رسالوں کا چھاپنا دوبھر ہو جائیگا - اور ضرورت جو ایجاد کی ماں کہلاتی ہے حسب ذیل ایجادیں کرائے گی -

(۱) ہر دفتر اخبار کا ایک ایجنٹ ہر شہر میں مقرر ہوگا جس کو خبریں اور مضامین خط میں لکھ کر بھیجدیئے جائیں گے - وہ سب خریداروں کے پاس جا جا کر مضامین اور خبریں سنا دیا کریگا -

(۲) کپڑے پر اخبار چھپیں گے -

(۳) کونسلوں میں آنریبل ممبر سوال کر کے گورنمنٹ سے یہ حق حاصل کریں گے کہ گانوں کے چوکیدار - پٹواری، پوسٹماسٹر، ہسکول ماسٹر - ڈاکٹر، حکیم، وید، امام، پیر روزانہ ڈپٹی کمشنر بہادر کے ہاں حاضر ہوں اور ان سے تازہ خبریں اور مضامین حاصل کر کے پبلک کو سنایا کریں اور جسقدر اخبارات اور رسالے ہیں انکے مالکوں کو جنگ کے کمسریٹ سے راشن ملجایا کرے -

دواؤں کی گرانی - ولایت کی بعض دوائیں اسقدر گراں ہوگئی ہیں جسکے سننے سے بخار چڑھ آئے - ایک روپیہ قیمت کے عوض بعض دوائیں چالیس روپیہ تک پہنچ گئی ہیں - ولایت پر حصر نہیں ہندوستان کی یونانی و ویدک ادویات کا بھی یہی عالم ہے مشہور

دواخانہ ہندوستانی دہلی نے بھی سوائی ڈیوڑھی اور بعض دواؤں کی دوگنی تگنی قیمت کر دی ہے۔ ایسی حالت میں سوائے اسکے کچھ چارہ نہیں کہ ملک کے نامور حکیم وید ڈاکٹر جمع ہو کر علم مسمریزم سیکھ لیں اور اسکے ذریعہ امراض کا علاج کریں یا وحشیانہ معالجات کا رواج جاری کیا جائے۔ اور وہ داغنا خون نکلنا ہے۔ کیونکہ ہر زمانہ میں تہذیب و وحشت کا اسی طرح سے مقابلہ ہوتا آیا ہے۔ کبھی تہذیب کا غلبہ ہوتا ہے۔ کبھی وحشت کا۔

کپڑے کی گرانی۔ روئی کت رہی ہے۔ سوت بنا جا رہا ہے کلف تھانوں سے گلے مل رہی ہے اس پر بھی غل ہے کہ کپڑے کا بھاؤ چڑھتا جاتا ہے۔ غریب لوگ ایسا مہنگا لباس نہیں خرید سکتے۔

کیا مضائقہ ہے آدمی برہنا پیدا ہوتا ہے جس سے معلوم ہوا کہ فطرتی اور نیچرل لباس برہنگی ہے۔ نیچر انسان کو ہمیشہ اصلیت کی طرف لاتی ہے۔ پس رفتہ رفتہ وہ مجبور ہو جائیگا اور اپنے مصنوعی لباس کو جو باعث تکلیف ہیں خیرباد کہدیگا۔ یہ حالت اسی وقت کا پیش خیمہ ہے۔

ایمان کی گرانی ہندوستان والے ہندوستان والوں پر ڈاکے ڈالتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم ملک کی خدمت کے واسطے روپیہ جمع کرتے ہیں۔ مگر اس اقتصادی مسئلہ پر غور نہیں کرتے کہ امن میں ایمان ارزاں ہوتا ہے اور بے امنی میں گراں۔ انہوں نے جنس ایمان کو فساد مچا کر مہنگا کر دیا ہے۔ ایمان ہی ہاتھ نہ آیا تو ملک کی ترقی کس کام آئے گی۔

مذاہب نے غارت، فساد، ڈاکہ زنی کو بہت معیوب قرار دیا ہے۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں اپنے دین دہرم کی جڑ کاٹتے ہیں۔ یہ کھیتی نہ رہی تو ایمان اور بھی مہنگا ہو جائیگا۔

خوشی کی گرانی۔ ساری زندگی کی بنیاد اطمینان اور خوشی پر ہے۔ آجکل یہ ساری دنیا میں گراں پائی جاتی ہے۔ سونے کی گنی پر چند آنے بڑھ گئے ہیں۔ اور خوشی کی نیند پر کروڑوں اشرفیوں کا اضافہ ہو گیا۔

بچے ہر قوم کے ہمیشہ خوش رہتے ہیں اور کسی غم کو پاس نہیں آنے دیتے۔ مگر سوقت نے

لاکھوں بچوں کی خوشی بھی چھین لی - لڑائی میں ان کے باپ مارے گئے تب بھی وقت نے ان کو خوشی نہ دی یعنی ان کو امن نہ اور مسافری کے جہازوں میں گولے مار مار کر ان بچوں کو ڈبو دیا-

یہ وقت چھوٹی قیامت ہے- جہاں ماں باپ بچوں کو اور بچے ماں باپ کو اپنے غم میں بھول گئے ہیں-

غم کی ارزانی- غم بہت سستا ہو گیا- محرم آنے سے پہلے اس کو خرید کر گھروں میں بھر لینا چاہیئے-

عاشق مزاج تلاش غم میں سرگرداں پھرتے تھے- آج بازار دہر میں یہ جنس اتنی ارزاں ہے جس کی کچھ حد نہیں- کوئی ان کو خبر دیدے-

غم اور فکر سنگدل آدمیوں کا قدرتی علاج ہے- بڑے بڑے سرکش فرعون غم دہر کے آگے سرنگوں ہو جاتے ہیں- آج کل غم اتنا سستا ہے کہ شاید دنیا سے کبر و نخوت دور ہونیکا وقت آیا ہے-

بے حیائی کی ارزانی- ہر چیز کی گرانی نے حیا فروش فرقہ کی ارزانی کردی ہے- یہ خطرناک ارزانی ہے- حکومت، سوسائٹی- اہل شریعت کو سطرف جلدی متوجہ ہونا چاہیئے ورنہ ارزانی پرست ہندوستان اس ڈاکو جماعت کے جال میں کثرت سے پھنس جائیگا

مکر و دغا کی ارزانی- ایمان کی گرانی کا نتیجہ عکسیہ یہ نکلا کہ ہندوستان میں مکر و دغا کا مول گھٹ گیا- مکاری کو پالیسی اور عقلمندی کہتے ہیں اور ادنیٰ درجے والے بھی جو ہمیشہ صاف کھرے ہوا کرتے تھے فریبی منافق بنتے جاتے ہیں- اس پر طرہ یہ کہ اس کو جائز اور شان ہوشمندی سمجھتے ہیں- یہ ارزانی اصلاح اور روک تھام کے قابل ہے- ایسا نہوا تو مرض بے دوا اور لاعلاج ہو جائے گا-

پیاری ڈکار

کونسل کی ممبری نہیں چاہتا۔ قوم کی لیڈری نہیں مانگتا۔ ارل کا خطاب درکار نہیں۔ موٹر اور شملہ کی کسی کوٹھی کی تمنا نہیں میں تو خدا سے اور اگر کسی دوسرے میں دینے کی قدرت ہو تو اس سے بھی صرف ایک "ڈکار" طلب کرتا ہوں۔ چاہتا یہ ہوں کہ اپنے طوفانی پیٹ کے بادلوں کو حلق میں بلاؤں اور پوری گرج کے ساتھ باہر برساؤں یعنی کڑاکے دار ڈکار لوں۔ پر کیا کروں یہ نئے فیشن والے مجھ کو زور سے ڈکار لینے نہیں دیتے۔ کہتے ہیں ڈکار آنے لگے تو ہونٹوں کو بھینچ لو اور ناک کے نتھنوں سے اسے چپ چاپ اڑا دو۔ آواز سے ڈکار لینی بڑی بے تہذیبی ہے۔

مجھے یاد ہے سر جیمس لاٹوش۔ یوپی کے لفٹنٹ گورنر علی گڑھ کالج میں مہمان تھے رات کے کھانے میں مجھ جیسے ایک گنوار نے میز پر زور سے ڈکار لیلی سب جنٹلمین اس بیچارے دہقانی کو نفرت سے دیکھنے لگے برابر ایک شوخ وطرار فیشن ایبل تشریف فرما تھے انہوں نے نظر حقارت سے ایک قدم اور آگے بڑھا دیا جیب سے گھڑی نکالی اور اس کو بغور دیکھنے لگے۔ غریب ڈکاری پہلے ہی گھبرا گیا تھا۔ مجمع کی حالت سے متاثر ہو رہا تھا۔ برابر میں گھڑی دیکھی گئی۔ تو اس نے بے اختیار ہو کر سوال کیا جناب کیا وقت ہے۔ شریر فیشن پرست بولا۔ گھڑی شاید غلط ہے۔ اس میں نو بجے ہیں مگر وقت بارہ بجے کا ہے کیونکہ ابھی توپ کی آواز آئی تھی۔

بیچارہ ڈکار لینے والا سنکر پانی پانی ہو گیا۔ کہ اسکی ڈکار کو توپ سے تشبیہ دی گئی۔

اس زمانہ میں لوگوں کو سیلف گورنمنٹ کی خواہش ہے ہندوستانیوں کو عام مفلسی کی شکایت ہے۔ میں تو نہ وہ چاہتا ہوں۔ نہ اسکا شکوہ کرتا ہوں مجھ کو تو انگریزی سرکار سے صرف آزاد ڈکار کی آرزو ہے۔ میں اس سے ادب سے مانگوں گا۔ خوشامد سے مانگوں گا۔ کوئی

نہ مانیگا تو کہے دیتا ہوں زور سے مانگونگا۔ جدوجہد کرونگا۔ ایجی ٹیشن مچاؤنگا۔ پُرزور تقریریں کرونگا کونسل میں جاکر سوالوں کی بوچھاڑ سے انریبل ممبروں کا دم ناک میں کردونگا۔

لوگو! میں نے تو بہت کوشش کی کہ چپکے سے ڈکار لینے کی عادت ہوجائے۔ ایک دن سوڈا واٹر پیکر اس بھونچال ڈکار کو ناک سے نکالنا بھی چاہتا تھا۔ مگر کمبخت دماغ میں اُلجھ کر رہ گئی۔ آنکھوں سے پانی نکلنے لگا۔ اور بڑی دیر تک کچھ سانس رُکا رُکا سا رہا۔

ذرا تو انصاف کرو۔ میرے ابا ڈکار زور سے لیتے تھے۔ میری اماں کو بھی یہی عادت تھی۔ میں نے نئی دُنیا کی ہمنشینی سے پہلے ہمیشہ زور ہی سے ڈکار لی۔ اب اس عادت کو کیونکر بدلوں۔ ڈکار آتی ہے تو پیٹ پکڑ لیتا ہوں۔ آنکھیں مچکا مچکا کے زور لگاتا ہوں کہ موذی ناک میں آجائے۔ مگر ایسی بدذات ہے نہیں مانتی حلق کو کھرچتی ہوئی مُنہ میں گھُس آتی ہے۔ اور ڈنکا بجاکر باہر نکلتی ہے۔

کیوں بھائیو تم میں سے کون کون میری حمایت کریگا۔ اور نئی روشنی کی فیشن ایبل سوسائٹی سے مجھ کو اس اکسٹریمسٹ حرکت کی اجازت دلوائے گا۔

خلقت تو مجھ کو حزب الاحرار یعنی گرم پارٹی میں تصوّر کرتی ہے۔ اور میرا یہ حال ہے کہ اپنی گرم ڈکار تک کو گرما گرمی اور آزادی سے کام میں نہیں لاسکتا۔ ٹھنڈی کر کے نکالنے پر مجبور ہوں۔

ہائے میں پچھلے زمانہ میں کیوں نہ پیدا ہوا۔ خوب بے فکری سے ڈکاریں لیتا۔ ایسے وقت میں جنم ہوا ہے کہ بات بات پر فیشن کی مُہر لگی ہوئی ہے۔

تم نے میرا ساتھ نہ دیا تو میں ماش کی دال کھانیوالے ٹھیموں میں شامل ہوجاؤنگا۔ کیسے خوش قسمت لوگ ہیں دُکانوں پر بیٹھے ڈکاریں لیا کرتے ہیں۔ اپنا اپنا نصیبا ہے۔ ہم ترستے ہیں اور وہ نہایت مسرفانہ انداز سے ڈکاروں کو برابر خرچ کرتے رہتے ہیں۔ پیاری ڈکار میں کہانتک لکھے جاؤں لکھنے سے کچھ حاصل نہیں۔ صبر بڑی چیز ہے۔

عید کی جوتی

جناب اکبر نے فرمایا تھا۔ ڈاسن نے جوتا بنایا۔ میں نے مضمون لکھا میرا مضمون نہ چلا۔ اور جوتا چل گیا۔

اب کوئی ان سے عرض کرے، ولائتی جوتوں کے دام اتنے بڑھ گئے ہیں کہ ان کے چلتے پاؤں بھی لنگڑے ہوئے جاتے ہیں۔

عید پر خلقت جوتے خریدنے جاتی تھی، اور دو جوتیاں لاتی تھی، جوتا مذکر ہے اور جوتی مونث۔ لڑائی نے مرد ختم کر دیئے عورتوں کو بڑھا دیا۔ تو مذکر جوتے کیوں نہ کم ہوتے مونث جوتیوں کا ڈھیر تھا۔ مذکر جوتے ناپید تھے۔

ہائے میری پیاری دلی کی پیاری پیاری نازک اندام وصلی کی جوتی چشم بد دور خدا نے اسکا نصیبہ جگایا۔ بارہ برس پیچھے دن پھرے۔ دلی والوں نے اٹھا کر سر پر رکھا۔ وصلی کی جوتی کی کیا بات ہے درحقیقت جوتی ہی کیسی بھولی بھالی کیسی ہریالی متوالی ولایتی بوٹ کی طرح خراٹ نہیں، یل پشل نہیں۔ دیکھنے میں دیدار، پہننے میں سکھ دینے والی۔ ولایتی جوتوں کے دام پوچھو گیارہ روپیہ سے بھی کچھ اوپر۔ اس جھنجھا کی قیمت تین چار حد سے حد پانچ چھ، دام کم کام بڑھیا۔ پرانی ہو جائے تو آٹھ دس آنے کو آنکھ بند کر کے بک سکتی ہے۔ مگر یہ بوٹ بگڑے پیچھے کوڑی کام کا نہیں۔

ذرا نام بھی خیال کرنا۔ وصلی۔ ہائے وصلی میں وصال کا اشارہ ہے یعنی وصلی کی جوتی پہنو۔ تو دام کم خرچ ہونگے اور دام کم خرچ ہونگے تو مطمئن رہیگا دل کا اطمینان وصال حقیقی ہے ولایتی جوتا موسمی اور فصلی جوتا ہے فصل جدائی کو بھی کہتے ہیں فصلی بخار کا نام بھی ہے

صاحب ہمنے تو اس شعر کو دل دیا ہے ؎

تو برائے وصل کردن آمدی
نے برائے فصل کردن آمدی۔

لہذا عید پر جوتی بھی وہ ملی جس کے نام میں وصل تھا فصل سے دور ہی رہے۔ گو گھر میں دو ایک فصلی بھی پڑے رہتے ہیں۔ مگر گفتگو ذ جفت عید میں تھی۔

اُلّ گلہری

گلہری ایک موذی جانور ہے۔ چوہے کی صورت۔ چوہے کی سیرت۔ وہ بھی ایذا دہندہ یہ بھی ستانیوالی۔ چوہا بھورے رنگ کا خاکی لباس گھتا ہے، فوجی وردی پہنتا ہے۔

گلہری کا رنگ چولھے کی سی راکھ کا ہوتا ہے پیٹھ پر چار لکیریں ہیں جس کو لوگ کہتے ہیں کہ حضرت بی بی فاطمہؓ کا پنجا ہے۔ گلہری کی دم چوہے کے برخلاف ہے چوہے کی دم پر بال نہیں ہوتے اس کی دُم گپھے دار ہے۔ گلہری کا سر چپٹا ہوتا ہے۔ چوہے اور اس کے سر میں تھوڑا ہی فرق ہے۔ گویا دونوں کا دماغ یکساں بنایا گیا ہے۔ چوہا بھی آدمیوں کی چیزیں خراب کرنیکی تجویزیں مغز سے اُتارتا ہے۔ اور گلہری بھی۔

چوہا مُنہ سے کھاتا ہے اور اگلے ہاتھوں سے نوالہ اُٹھا کر اسے کترتا ہے۔ مگر گلہری کی طرح ہمیشہ نہیں۔ کبھی کبھی اور گلہری تو ہمیشہ اوکڑوں بیٹھ جاتی ہے ہاتھوں میں کھانیکی چیز لیتی ہے۔ دُم ہلاتی جاتی ہے۔ کترتی ہے۔ پھدکتی ہے اور کتر کتر کر کھانا کھاتی ہے۔

چوہا بیچارا بلوں میں موریوں میں میلے کچیلے سوراخوں میں گھر بناتا ہے۔ گلہری بڑی تمیزدار ہے۔ یہ اکثر مکانوں کی چھتوں میں گھونسلا بناتی ہے جس گھر میں ان جناب کا جی چاہا بے پوچھے گچھے جا پہنچتی ہیں اور رضائی توشک لحاف یا جو روئی دار چیز سامنے آئی اس کو کتر ڈالتی ہیں اس میں سے روئی نکالتی ہیں اور اپنے گھر میں اس کے گدّے بنا کر بچھاتی ہیں۔ اور پھر نرم نرم بستر پر بچے دیتی ہیں۔

رات بھر گھر کی مالک ہیں۔ صبح ہوئی اور یہ چل چل چلّل چلّل چل چل چل چلّل چلّل، چلّل چلّل، چل چلّل، چل چلّل کہتی۔ اپنی بولی میں خدا کی عبادت کرتی یا آدمی کو گالیاں دیتی ہوئی

باہر نکلجاتی ہیں۔ سارا دن ہے اور ان کا پیٹ ہی جنگل پہنچتی ہیں۔ پھل دار درختوں پر چڑھ جاتی ہیں اور خوب کھاتی پیتی ہیں۔ سڑکوں پر دوڑتی پھرتی ہیں۔ جہاں ذرا سا کھٹکا ہوا اور انہوں نے دونوں ہاتھ اٹھا کر جنکے پنجے جھکے ہوتے ہیں اور پیروں کے بل کھڑے ہوکر ادہر ادہر گھبرا کر دیکھا چل چل کی دم کو ہلایا۔ کیونکہ ان کی دم ہر چل کے ساتھ تھرکتی ہے۔ کوڑے کی طرح تڑپ کر بل کھاتی ہے۔ اور بھاگ گئیں۔ گلہری کے بچے بھی چوہے کی طرح لال گوشت کی بوٹی ہوتے ہیں۔ ان پر بال نہیں ہوتے۔ آنکھیں بند ہوتی ہیں۔ کچھ دن بعد بال نکلتے ہیں آنکھیں کھلتی ہیں اور دنیا میں غریب آدمی کے دوستانیوالے اور بڑھ جاتے ہیں

میں نے اوپر کہا ال گلہری۔ عربی ال کو میں نے انگریزی دی کی طرح اس ہوذن سے الگ رکھا ہے۔ ملا دیتا تو گلہری کے کاٹنے کا ڈر تھا۔ بڑی شریر ہے۔ بڑی فتنی ہے۔ میری بادشاہی ہو تو سب سے پہلے گلہریوں کا قتل عام کراؤں اور اس کے زن بچے کو لہو میں پلوا دوں۔

میری خوبصورت چھت گیری میں جگہ جگہ بھمباقے لگا دیئے ہیں۔ لکڑی لیکر مارتا ہوں تو کیا مجال باہر نکلجائے چھت گیری کے اندر دوڑتی پھرتی ہے۔ میں دوڑتا دوڑتا ہانپ جاتا ہوں پسینہ سارے کپڑوں کو تر کر دیتا ہے۔ مگر یہ بے غیرت اچھلتی پھرتی ہے ادہر سے اُدہر۔ اُدہر سے اِدہر۔

کونسل میں سوال

میرا ارادہ ہے کہ کسی آنریبل ممبر کونسل کو لکھوں کہ ایکے ال گلہری کی بابت بھی ایک سوال کریں۔ جس کے الفاظ یہ ہوں۔

کیا گورنمنٹ کے علم میں یہ امر موجود ہے کہ ہندوستان کی نہایت وفادار رعایا کو ایک موذی جانور گلہری نے بہت ستا رکھا ہے۔

گورنمنٹ کی وہ مساعی جمیلہ کونسل کو یاد ہیں جو عرصہ دراز سے چوہوں کے خلاف استعمال کی جاتی ہیں یعنی ان کو پکڑ کر ہلاک کر دینے کا پورا بندوبست کر دیا گیا ہے۔

لہذا میں بنہایت ادب یہ مسودہ پیش کرنا چاہتا ہوں کہ اُل گلہری کے مسئلہ پر بھی توجہ کیجائے۔ اس جانور میں بھی پسو ہوتے ہیں۔ یہ بھی بیماریوں کی چھوت کو باہر سے گھروں میں لاتی ہے۔ یہ بہت خطرناک معاملہ ہے۔ گورنمنٹ میونسپل کمیٹیوں کو ہدایت کرے کہ آئندہ گلہریاں ہر جگہ پکڑی جائیں اور ہلاک کی جائیں۔

مفتیان ہند سے استفتاء

کیا فرماتے ہیں مفتیان دین بیچ اس مسئلہ کے کہ ایک گھریلو غیر پالتو جانور جس کو گلہری اور اسوقت اُل گلہری بھی کہتے ہیں۔ متبرک مقدس کتابوں کو کاٹ ڈالتا ہے اور صریحاً کتب مقدسہ کی توہین کرتا ہے۔ آیا ایسے بدذات حیوان پر جو پرندہ ہے اپنے دوڑنے اور بھاگنے اور دیواروں چھتوں پر پھرتی سے چڑھ جانے کے سبب اور درندہ ہے اپنے نوکدار دانتوں کے ناجائز استعمال کرنے میں موذی کا اطلاق عائد ہوتا ہے یا نہیں اور قتل الموذی قبل الایذا کا حکم اس پر صادق آتا ہے یا نہیں۔ بینوا توجروا

اے اُل گلہری مجھے افسوس ہے کہ تیرا نام اس مضمون کے لکھنے سے اُردو ادب میں شامل ہو گیا۔ میں نہ چاہتا تھا کہ تیرا ذکر ایک شیریں راحت جان زبان میں آئے۔ مگر کیا کروں جیسا تو نے مجھ کو ستا کر بے بس کیا ہے۔ ایسا ہی تیرا تذکرہ جبراً میرے قلم کے مُنہ میں آیا۔ اور چل چل کرتا نکل گیا۔

میری مقتول قمری

مجھ خاکی پتلے کی خاکسار خاکستری کرنے والی لاڈلی قمری کو سفاک بلی نے قتل کر ڈالا الٰہی اس بلی کو ہمیشہ جلتا بھنتا رکھیو۔ جس نے میری معصومہ کو پنجرے سے نکالکر چبا ڈالا۔ بلی بہت بُرا جانور ہے۔ حضرت اکبر الہ آبادی نے ایک شعر میں فرمایا تھا ؎

خواجہ حسن نظامی سے دلی نہ چھٹ سکی ۔ حضرت ابو ہریرہ سے بلی نہ چھٹ سکی

آج مجھے بلّی سے اسقدر نفرت ہے کہ اس کے ہم وزن قافیہ دِلّی کو بھی چھوڑنے پر آمادہ ہوں۔ موئی بلّی۔ خاک میں ملی بلّی۔ تیرے ہاتھ کیا آیا۔ میری کم سخن قمری کو ہلاک کرنے سے تجھے کیا مل گیا۔ اس بیچاری میں گوشت ہی کتنا تھا یادالٰہی کرتے کرتے ہڈیوں کی مالا بنگئی تھی۔ ذرا دیکھو کیسی چوروں کی طرح آنکھ بچاتی۔ سہج سہج پاؤں دھرتی دُم ہلاتی پنجرے تک آئی اور کھڑکی پر ایسا پنجہ مارا کہ وہ کھُل گئی اور پھر پھڑاتی ہوئی ننھی سی جان کو نکال کر لے اڑی۔ ہائے قمری کی بے کسی ظلمن بلّی منڈیا کو منہ میں دبا کر لے چلی۔ اور اس کو پر ہلانے اور ٹھونگ مارنیکا بھی موقع نہ دیا۔

دیکھنا سارے صحن میں مقتولہ کے پر بکھرے پڑے ہیں۔ خدا نے اپنی عابدہ کو کیسا سہانہ صوفیانہ لباس دیا تھا جس کو نامراد بلّی نے اُتار ڈالا۔ اور پیروں میں روندنے کو راستہ میں ڈال گئی۔ للہ کسی مولوی صاحب کو خبر دو وہ اس پر کفر کا فتویٰ لگائیں اس نے خدا کے عطیہ کی بڑی بے ادبی کی ہے۔

ارے یہ طوطا نہ تھا مینا نہ تھی۔ جو آدمیوں کو دنیا یاد دلاتے ہیں۔ یہ قمری تھی جو خدا کا نام یاد دلاتی تھی۔ اندھیرے سے اُٹھتی تھی۔ حق سرہٗ حق سرہٗ کہکر جگاتی اور کہتی اُٹھو جاگو اُس کو یاد کرو جس نے پیدا کیا ہے۔

ہائے یہ تو وہ جانور ہے جس کو دُنیا پرست منحوس کہتے ہیں اسکی آواز میں ویرانہ بن سمجھتے ہیں۔ بلّی تو نے اس کو کیوں مارا۔ یہ تو میرے ویران دل کی آبادی تھی میرے چپ چاپ گھر کی رونق تھی۔ کسی اونچے محل میں گئی ہوتی غفلت کی مستی میں سونے والوں کے طوطے مینا کو مارا ہوتا۔ میری قمری کو مار ڈالا۔ میرے ٹوٹے دل کو اور اُجاڑ ڈالا۔

قمری مر گئی اُسکا قمرا پنجرے کے اندر نڈھال۔ خاموش بیٹھا ہے نہ کھاتا ہے نہ پیتا ہے۔ سناٹے میں ہے۔ روتا بھی نہیں ہنستا بھی نہیں۔ اس کو سمجھاؤ دنیا فانی ہے

آنی جانی ہے۔ قمری کا غم نہ کر۔ مرنے والی جان سے گئی اب وہ نہیں آسکتی تیرے ماتم سے کچھ نہو گا۔ میرے دل میں تو جب آزادی کی محبت پھریری لیتی تھی تو ان قمریوں کی قید ناگوار ہوتی تھی اور ان کو آزاد کر دیتا تھا مگر ان سے اُڑا نجاتا تھا۔ اُڑتی تھیں اور گر پڑتی تھیں اور زبان حال سے کہتی تھیں۔ قید نے جسکے بازو شل کر دیئے ہوں اسکو آزادی دینا بلی کے منہ میں دینا ہے۔ میں پھر پکڑ کر پنجرے میں ڈال دیتا تھا کیا خبر تھی میرے جیل کے اندر بھی اتحاد قاتلہ بلی کا حملہ ہو سکتا ہے۔ میں قمریوں کی جان کا ذمہ دار۔ خدا کو کیا جواب دونگا جب وہ مجھ سے پوچھیگا کہ بے زبان جانور کو قید کر کے حفاظت نہ کی اور دشمن سے ہلاک کرا دیا۔ کہدونگا پروردگار تو جانتا ہے۔ دو برس تک اپنی پلنگ کے پاس رکھا اور بلی کے بیشمار حملوں سے انکو بچایا آج ذرا کے ذرا غافل ہوا تھا جو سانحہ عظیم پیش آگیا۔ اب تجھے اختیار ہے جو چاہے سزا دے۔

مسلم لیگ و کانگریس سے درخواست

کمال ادب مگر زور کے ساتھ میں اراکین مسلم لیگ و کانگریس اور اجازت مرحمت ہو تو آنریبل ممبران کونسل سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ میری قمری کے لئے ایک ماتمی ریزولیوشن اپنے جلسوں میں پاس کر دیں کیونکہ یہ حادثہ ملیہ ہے۔ میں حق رکھتا ہوں کہ میری ملت اور ملک کے لوگ مجھ سے ہمدردی کریں۔

رائٹر ایجنسی کو چاہیئے کہ وہ اس الم ناک خبر کا اعلان تمام دنیا میں کر دے کیونکہ اس خبر سے بڑھ کر کوئی خبر نہیں ہو سکتی جسمیں اس کی برابر غم واندوہ ہو۔

قمری کا مزار

قلق اسکا ہے کہ بلی نے قمری کی لاش بھی کہیں برباد کر دی۔ ورنہ اس کو سرو کے سایہ تلے دفناتا۔ اسکی آرزو تھی کہ ع قدموں میں دلربا کے میرا مزار ہوتا۔ اور

سرو اسکا محبوب تھا مگر غریب کو بہت جلاتا تھا جب ہی تو شاعر نے جلکر کہا تھا ؎

دلِ قمری کو جو اے سرو جلایا تو نے
یہ اثر ہے کہ ثمر تک بھی نہ پایا تو نے

قمری کا جنازہ دہوم سے اُٹھتا۔ پھولوں کی گلیوں سے ہوکر سایۂ سرو میں جاتا پھول بُلبُل سے کہتا تو اگر مرجائے تو ہماری گلی میں دفن ہونے آئے مگر تو تو زندہ رہنے پر مرتا ہے۔ بُلبُل اسپر رشک کرتا اور قمری کے جنازہ کو گلوں کی گلی سے نہ گذرنے دیتا مجھ کو اسکی خبر ہوتی تو میں حاکم دہلی کے پاس جاتا وہ مجکو پولس کی جمعیت دیتے اور اسکے زور سے میں بلبل کی مزاحمت کو دور کرکے اپنی قمری کی میت سرو کے تلے دفن کر دیتا اور سرہانے ایک تختی لگا دیتا جسپر مرقوم ہوتا:-

ناشاد قمری کی تربت جس کو جلاد بلی نے مار ڈالا سنہ ۱۹۱۶ء کی سب بڑی مصیبت کی یادگار میں یہ تختی لگائی گئی تاکہ سیاسیات اقتصادیات اور وہ تمام خشکیات جن کو رسالہ اُسوۂ حسنہ میرٹھ شائع کرتا ہے کچھ دن کے لیئے دلوں کو مُردہ کرنے سے باز رہیں +

حسن نظامی

یہ تختی دیکھ کر ناظرین اور پبلشر و پرنٹر اسوۂ حسنہ اینڈ پارٹی ناراض ہوتے اور میں اپنی قمری کا غم غلط کرنے کو اسپر ہنستا +

حسن نظامی

قرآن آسان قاعدہ

یہ حضرت خواجہ صاحب کی بالکل تازہ تصنیف ہے مگر سالہا سال کے تجربہ اور مشاہدات کے بعد لکھا گیا ہے۔ مسلمان بچوں کیلئے ازحد مفید ہے۔ بن دیکھے پڑھایا جاتا ہے۔ اس کے پڑھنے سے بچوں کے دماغ پر زور نہیں پڑتا، ان کا دل پڑھنے سے نہیں گھبراتا۔ وہ ایک قاعدہ پڑھنے کے بعد اردو عبارت اور قرآن شریف آسانی سے پڑھنے لگتے ہیں۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ صرف ایک قاعدہ پڑھنے سے اسلامی تعلیم کا خلاصہ بچے کے ذہن نشین ہو جاتا ہے اور پھر ساری عمر یاد رہتا ہے۔

آج تک کوئی قاعدہ بچوں کی طبعی دماغی اور ذہنی ضرورتوں اور بالکل فطری اصول کے موافق نہیں لکھا گیا تھا اس قاعدہ نے تمام باتوں کو پورا کر دیا۔ خدائے تعالیٰ نے آپ کو اولاد دی ہے۔ تو یہ قاعدہ ضرور پڑھائیے، یا کم از کم ایک کاپی بطور نمونہ منگا کر دیکھئے آپ کو خود معلوم ہو جائیگا کہ کیسی مفید اور اعلیٰ چیز ہے۔ اسلامی عمارات مثلاً کعبہ شریف۔ روضہ رسول خدا۔ کربلائے معلیٰ۔ بغداد شریف۔ بیت المقدس، سلطانجی صاحب۔ قطب مینار۔ روضہ اجمیر شریف۔ جامع مسجد دہلی۔ تاج محل آگرہ۔ وغیرہ کی تصاویر ہیں۔ نیز معلومات اشیاء کی تصاویر بھی ہیں مگر کسی انسان یا جاندار کی تصویر نہیں ہے۔ ضخامت ۶۴ صفحے بڑا سائز۔ کاغذ عمدہ چھپائی بہت صاف۔ قیمت آٹھ آنے (۸/)

دوسرا حصہ تعلیم القرآن

قرآن آسان قاعدہ پڑھنے کے بعد یہ پڑھنا چاہیے۔ تمام قرآن شریف کا انتخاب ہے۔ قیمت آٹھ آنے (۸/)

ملنے کا پتہ

حلقہ مشائخ بک ڈپو عرب سرائے دہلی

ح

ظرافت

دیکھو

اردو مزاح

طنز

ادب